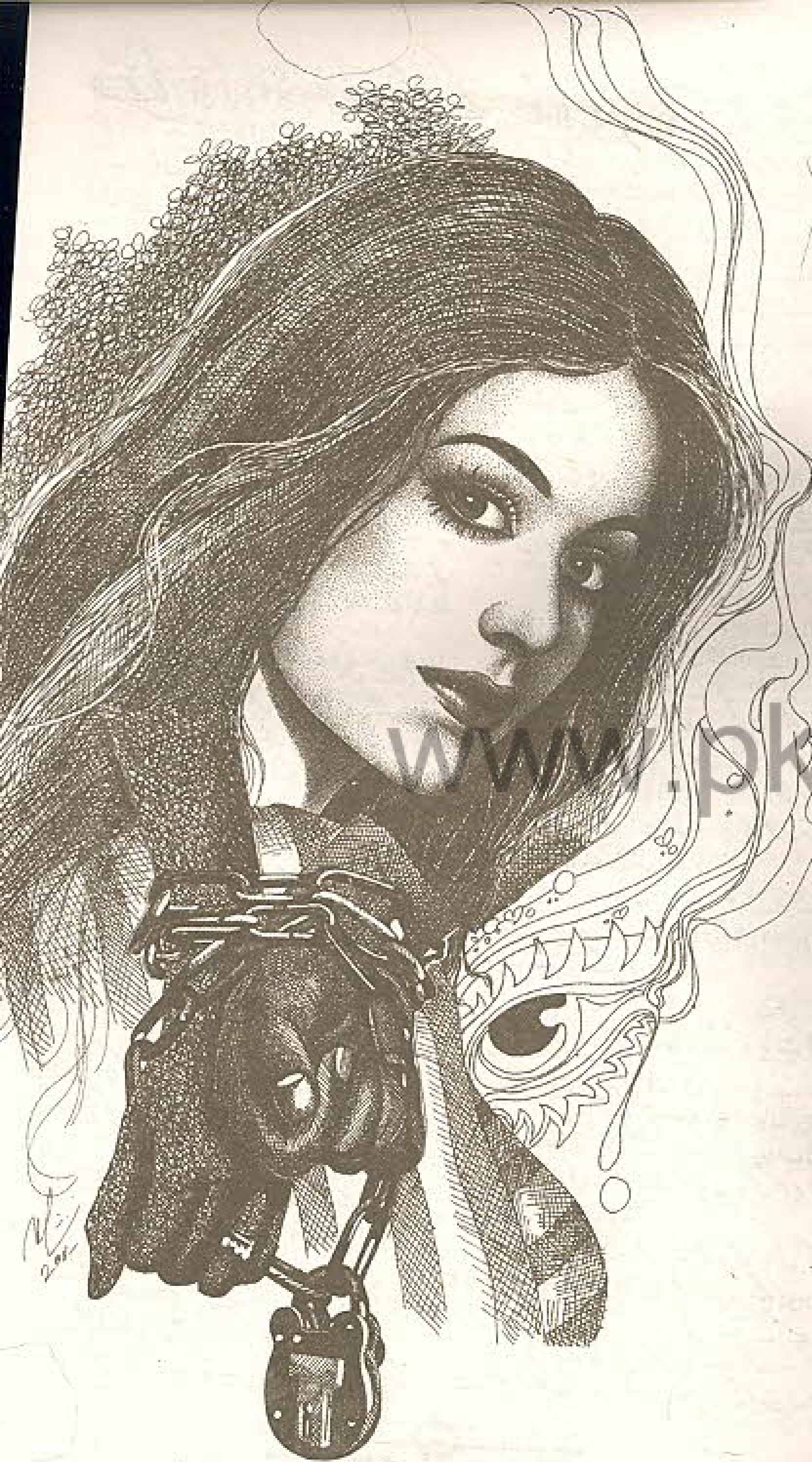


اولین صفحات پر آپ کے ذوقِ طبع کی نذر... پسندیدہ مصنف کی خاص تحریر

ستم زادہ

محی الدین نواب

کیا دکھوں کو کسی طرح جڑ سے اکھاڑ کر پھینکا جا سکتا ہے ... دکھ کا حاصل کیا ہے ... اور دکھ انسان کی زندگی میں کہاں کہاں معاون ثابت ہوتے ہیں... انہی سوالوں کا احاطہ کرتی ایک نوجوان کی زندگی کے نشیب و فراز... دنیا اسے لاوارث سمجھتی تھی... بے حس لوگوں کی نشتر زنی نے اسے رنجیدہ و دل گرفتہ بنا دیا ... وہ اپنی بکھری بکھری سوالیہ زندگی کا جواب چاہتا تھا... بالآخر اس کے زخمی وجود کے لیے ... دکھ ہی معاون ثابت ہوئے ... اور اس کی زندگی کو یقینی طور پر منزل کے قریب لے گئے۔

ایک واہمہ... ایک خواب... گمان و یقین کے درمیان معلق تعبیر و جستجو کا فسانۂ عجب

اُس کا نام کامران تھا۔ کامران اسے کہتے ہیں جو منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے لیکن وہ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی بھٹک رہا تھا۔ لہٰذا موجودہ حالات میں وہ کامران نہیں تھا۔

والدین خوش فہمی میں مبتلا ہو کر بچے کا نام شیر علی رکھ دیتے ہیں لیکن وہ آگے چل کر گیدڑ نکلتا ہے۔ بہت کم لوگ اسم با مسمّیٰ ہوتے ہیں۔ فی الحال وہ اپنے نام کے مطابق کامیاب و کامران تھا۔

کامران... نام اس کی ماں یا باپ نے نہیں رکھا تھا۔ اگر انہوں نے رکھا ہوتا تو نام کے ساتھ باپ کا نام ہوتا لیکن وہ ولدیت سے محروم تھا۔ اس کا باپ نہیں تھا۔

ماں باپ کے بغیر کوئی دنیا میں نہیں آتا۔ اس کے بھی ماں باپ ہوں گے یا اپنا نام و نشان چھوڑے بغیر کہیں مر کھپ گئے ہوں گے۔ اگر زندہ ہوں گے تو اسے دایا نانی کی دہلیز پر پھینک کر کہیں عیش و عشرت کی دنیا میں مگن ہوں گے۔

جب وہ بہت چھوٹا تھا تو اس نے نانی سے پوچھا کہ میرے امّی اَبو کہاں ہیں؟

اس نے جواب دیا۔ "وہ مر چکے ہیں۔ میں ہی تمہاری ماں ہوں، میں ہی تمہارا باپ ہوں۔"

نانی نے اسکول میں اس کے باپ کا نام محمد ہاشم لکھوایا تھا۔ جیسے جیسے وہ جوان اور باشعور ہوتا گیا، اسے حقیقت معلوم ہوتی گئی کہ نانی نے فرضی باپ کا نام لکھوایا ہے۔ اس کے باپ کا کوئی پتا ہوتا تو صحیح نام بھی معلوم ہوتا۔

اس کی نانی نے ہمیشہ اسے سمجھایا تھا۔ "تم میری بیٹی کے بیٹے ہو۔ وہ تمہیں پیدا کرنے کے بعد مر گئی تھی اور باپ تو پہلے ہی دنیا سے چلا گیا تھا۔"

اس محلے میں ایسے لوگ تھے جو برسوں سے وہاں آباد تھے۔ ایک بوڑھی خاتون نے بتایا تھا کہ اس کی نانی زیتون کی کوئی بیٹی یا بیٹا نہیں تھا۔ وہ بانجھ تھی۔ شوہر نے اسے طلاق دے دی تھی۔ پھر اس نے کبھی شادی نہیں کی۔

زیتون آس پاس کے علاقے میں دور تک دائی ماں

کہلاتی تھی۔ جب کامران دنیا والوں کی ہیرا پھیری کو کسی حد تک سمجھنے لگا تو نانی کی ہیرا پھیری بھی سمجھ میں آ گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ زیتون بڑی رازداری سے ناجائز بچے پیدا کرنے والوں کی مشکلیں آسان کرتی ہے اور ہزاروں روپے کماتی ہے۔

یہ دنیا ایک معلّم کے مانند ہے۔ یہاں جو حاضر دماغی اور ہوشیاری سے دنیا کو دیکھتے ہیں اور بہت کچھ سیکھتے رہتے ہیں، وہ ایسے ماہر ہو جاتے ہیں کہ کسی کے فریب میں نہیں آتے اور منہ سے نکلتے ہی جھوٹ کو پکڑ لیتے ہیں۔

اس نے مشتعل ہو کر پوچھا۔ ''دایا نانی! تم نے جھوٹ کیوں کہا تھا؟ تمہاری کوئی بیٹی نہیں تھی۔ تم میری سگی نانی نہیں ہو۔ اب تک مجھے دھوکا دیتی آ رہی ہو۔''

وہ سر ہلا کر بولی۔ ''میں جانتی تھی، ایک دن جھوٹ کھلے گا۔ محلے میں درجنوں لوگ ہیں جو میری زندگی سے اب تک کی بہت ساری باتیں جانتے ہیں۔ ان کے پیٹ میں بات رہنے والی نہیں تھی۔ آخر انہوں نے تمہارے سامنے اُگل ہی دی۔''

''تم ناجائز کام کرتی ہو۔ گناہ گار لڑکیوں سے رقم لے کر ان کا حمل ضائع کر دیتی ہو پھر مجھے ضائع کیوں نہیں کیا؟''

زیتون نے کہا۔ ''جب تین چار ماہ گزر جاتے ہیں، تب بچے کو ضائع نہیں کیا جاتا۔ ایسا کیا جائے تو ماں کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔''

''اچھا تو کسی عورت نے گناہ کیا اور پھر پارسا بننے کے لیے تمہیں رازدار بنا لیا تاکہ تم مجھے پیدا ہونے سے پہلے ہی مار ڈالو۔''

وہ بڑی نفرت سے بول رہا تھا۔ ''پھر معلوم ہوا کہ ایسا کرنے سے وہ خود مر سکتی ہے تو اس نے مجبوراً مجھے پیدا کیا... یہی بات ہے ناں؟''

وہ اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے مزید بولا۔ ''میں غیر ضروری تھا۔ اس کے وجود سے نکلا ہوا کچرا تھا اس لیے پیدا کرتے ہی مجھے پھینک دیا۔ پھر تم مجھے اٹھا کر کیوں لے آئیں؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''یہ بات نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟ کیا اس نے گناہ نہیں کیا؟ کیا اس نے مجھے پھینک نہیں دیا؟''

''پھینکنا ہی ہوتا تو تمہیں پیدا ہوتے ہی مار ڈالنے میں ذرا دیر نہ لگتی مگر وہ چاہتی تھی، تم زندہ رہو۔''

دایا نانی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''اس کی عزت کرو۔ وہ ایک محترم ماں ہے۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے لیکن اس نے یہ بات گھر والوں سے چھپائی۔ مگر اس کو چھپایا نہیں جا سکتا... جب گھر والوں کے سامنے یہ بات آئی تو وہ پریشان ہو گئے۔ مجھے دس ہزار روپے دے کر کہا کہ میں اس قصے کو رازداری سے ختم کر دوں۔

لیکن وقت بہت گزر چکا تھا۔ اگر بچے کو ضائع کیا جاتا تو ماں زندہ نہ رہتی۔ اسپتال والے بھی اسے بچا نہ پاتے۔ تب ان لوگوں نے کہا کہ ان کے ایک فارم ہاؤس میں رازداری سے ولادت ہوگی۔ پھر بچے کو مار کر وہیں ایک گڑھے میں دبا دیا جائے گا۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''انہوں نے اس کام کے لیے پورے بیس ہزار روپے کی پیشکش کی تھی۔ آج سے بائیس برس پہلے بیس ہزار بہت ہوتے تھے۔ میں اس کیس کو نمٹا کر مالدار ہو رہی تھی اس لیے فوراً ہی راضی ہو گئی۔

''مجھے ایک کار میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک فارم ہاؤس... پہنچایا گیا۔ وہاں میں نے تمہاری ماں کا معائنہ کیا اور اس کے بزرگوں سے کہا کہ کل تک ولادت ہو سکے گی۔

وہ بزرگ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ تنہائی میں تمہاری ماں نے میرے ہاتھ تھام لیے اور گڑگڑا کر کہا۔ ''میں اپنے بچے کی زندگی چاہتی ہوں۔''

میں نے اسے تسلی دی۔ ''اطمینان رکھو۔ میں نے معائنہ کیا ہے۔ تم بھی صحت مند ہو، بچہ بھی صحت مند ہے۔ تمہارا بچہ سلامتی سے دنیا میں آئے گا۔''

وہ بولی۔ ''وہ سلامتی سے پیدا ہوگا لیکن میرے ابو اور دادا جان اسے مار ڈالیں گے۔ بدنامی کو اسی فارم ہاؤس میں دفن کر کے جائیں گے۔'' وہ رونے لگی۔

مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں نے بے بسی سے کہا۔ ''میں کیا کر سکتی ہوں؟ تمہارے بزرگ جو چاہتے ہیں، وہ ہونے دو اور کوئی چارہ نہیں ہے۔''

''تم کوشش کرو گی۔ میرے بچے کو یہاں سے زندہ سلامت لے جاؤ گی تو میں تمہیں ایک لاکھ روپے دوں گی۔''

''ایک لاکھ...؟'' میری اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ ''ایک لاکھ روپے...''

میں دم بخود رہ گئی۔ میں نے ایک لمبی سانس کھینچ کر پوچھا۔ ''تم سچ کہہ رہی ہو؟ کیا تم آج ہی مجھے ایک لاکھ روپے دے سکو گی؟''

''آج تمہیں پچاس ہزار ملیں گے۔ اس کے بعد تم بچے کو کہیں حفاظت سے رکھنے کا انتظام کرو گی تو پچاس ہزار

دوں گی اور جو عورت میرے بچے کی پرورش کرے گی، اسے ہر مہینے دس ہزار روپے دیا کروں گی۔''

میں تو مل کر رہ گئی۔ گھر بیٹھے ماہانہ دس ہزار روپے مل سکتے تھے۔ پھر الگ سے ایک لاکھ روپے مل رہے تھے۔ میں نے تمہاری ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''میں تو جان دے دوں گی مگر بچے پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ، پیشگی رقم مجھے آج کیسے ملے گی؟ کیا رقم ابھی تمہارے پاس ہے؟''

''میرے پاس نہیں ہے لیکن رات ہوتے ہی وہ یہاں چھپ کر آئیں گے۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ کون؟''

''وہ جو اس ہونے والے بچے کے باپ ہیں۔ ہم نے تہیہ کیا ہے، اپنے بچے کو ہر حال میں بچائیں گے۔ بزرگوں نے پہلے ہماری شادی نہیں ہونے دی اب بچے کو مار ڈالنا چاہتے ہیں اور ہم اس کی سلامتی کے لیے کچھ بھی کر گزریں گے۔''

وہ بوڑھی دایا بول رہی تھی اور کامران اپنے ماں باپ کی روداد سن رہا تھا۔ پہلے وہ بدظن تھا کہ ماں باپ نے اسے کچرا سمجھ کر پھینک دیا ہے۔ اب ان کی محبت اور قدر و منزلت دل میں گھر کر رہی تھی۔

اس نے کامران کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''رات کا اندھیرا پھیلتے ہی تمہارا باپ وہاں چھپ کر آیا۔ تمہاری ماں کے ابو اور دادا دوسرے کمرے میں رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ چونکہ بڑی رازداری سے یہ معاملہ نمٹایا جا رہا تھا اس لیے وہاں اور کوئی رشتے دار یا نوکر نہیں تھا۔

تمہارا باپ پچھلے دروازے سے چھپ کر آیا تھا۔ میں نے کہا، میں اس ہونے والے بچے کی پرورش کروں گی۔ وہ جب چاہیں گے، چوری چھپے میرے گھر آ کر بچے کی خیر خیریت معلوم کر سکیں گے۔

تمہارا باپ بھی بہت نام والا تھا۔ تمہیں اپنے گھر نہیں لے جا سکتا تھا۔ میں نے تمہاری پرورش کی ذمے داری لے کر ان کی مشکل آسان کر دی تھی۔

رات کے دس بجے وہ دردِ زہ میں مبتلا ہوئی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ایسے وقت مجھے کیا کرنا چاہیے؟

میں نے تمہاری ماں کے باپ سے کہا۔ ''یہ ناقابلِ برداشت تکلیف میں ہے۔ میں ایک انجکشن لکھ رہی ہوں۔ آپ فوراً شہر جا کر لے آئیں۔''

میں نے ایک پرچی لکھ کر دی۔ وہ اپنی کار میں وہاں سے چلے گئے۔ ایک گھنٹے سے پہلے واپس آنے والے نہیں تھے اور میرے تجربے کے مطابق آدھے گھنٹے میں ہی ولادت ہو گئی۔ تم صحیح سلامت اس دنیا میں آ گئے۔

اسی وقت دوسرے کمرے سے دادا جان وہاں آئے۔ وہ تمہیں ختم کرنا چاہتے تھے لیکن تمہارا باپ وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بڑے میاں کو ریوالور کے نشانے پر رکھ کر کہا۔ ''خاموشی سے اپنی پوتی کے پاس بیٹھو۔ یہ پوتی تمہاری ہے، تمہیں مبارک ہو۔ یہ بیٹا میرا ہے۔ میں اسے لے جا رہا ہوں۔''

پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ''تم بھی میرے ساتھ چلو میرے گھر تک۔ میرے بیٹے کی دیکھ بھال تم کرو گی۔ ورنہ میں تمہیں بھی گولی مار دوں گا۔''

میں بڑے میاں کے سامنے خوفزدہ ہو کر اس کمرے سے باہر نکل گئی۔ تمہارے باپ نے دروازے پر آ کر تمہاری ماں سے کہا۔ ''ان بزرگوں نے ہماری شادی کی مخالفت کی۔ ہمیں ازدواجی رشتے میں منسلک نہیں ہونے دیا۔ کوئی بات نہیں، ہم ایک دن ضرور ملیں گے۔ یہ بیٹا ہمیشہ ہم دونوں کو جوڑ کر رکھے گا۔ تم میری دلہن ضرور بنو گی۔''

بیچاری ماں تم سے جدا ہو کر رو رہی تھی۔ مگر اندر سے خوش تھی کیونکہ تمہیں ہلاک کرنے والے ناکام رہے تھے۔ تم زندہ سلامت اپنے باپ کے ساتھ جا رہے تھے۔''

کامران نے مسرتوں سے سرشار ہو کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میں اپنی امی اور ابو پر تمام عمر فخر کرتا رہوں گا۔ پہلے لاوارث ہونے کے غم میں گھل رہا تھا۔ اپنے پیدا کرنے والوں سے بدظن تھا۔ اب میں ان کی عظمت کے سامنے سر جھکا رہا ہوں، چشمِ تصور سے انہیں دیکھ رہا ہوں۔''

پھر اس نے چونک کر پوچھا۔ ''ان کے نام کیا تھے؟ تم اتنی ساری اہم باتیں بتا رہی ہو، ان کے نام نہیں لے رہی ہو؟''

''اس لیے کہ میں ان کے نام نہیں جانتی۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ میں آم کھاؤں پیڑ نہ گنوں۔ ان کے بارے میں کوئی سوال نہ کروں۔ تمہارے باپ نے مجھے ایک لاکھ روپے دیے تھے اور ہر ماہ دس ہزار دینے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر میں تمہیں اپنے گھر لے آئی تھی۔''

''وہ تمہیں ماہانہ رقم دینے کے لیے یہاں آتے ہوں گے؟''

وہ بڑے دکھ سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی۔ ''میرے نصیب میں ایک لاکھ تو کیا، ایک روپیہ بھی نہیں تھا۔ تمہارے ماں باپ زبان کے سچے تھے۔ انہوں نے رقم دی

تھی لیکن میرا خاوند ایک لاکھ روپے لے کر فرار ہوگیا۔ میں خالی ہاتھ رہ گئی۔ تمہاری ماں ایک بار چھپ کر میرے گھر آئی تھی۔ تمہیں دودھ پلایا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ تمہارے ابو یہاں آئے تھے۔ مجھ سے پوچھ رہے تھے، بچہ کہاں ہے؟

وہ پریشان ہوکر بولی۔ ''پھر تم نے کیا کہا؟''

''میں نے تسلی دی کہ بچے کو چھپا دیا تھا۔ تمہارے ابو مایوس ہوکر وہاں سے چلے گئے پھر گلی میں رک کر دو چار لوگوں سے باتیں کیں۔ اور انہوں نے معلوم کرلیا کہ میں کسی بچے کو لے کر یہاں آئی تھی۔''

تمہاری ماں نے گھبرا کر پوچھا۔ ''پھر تو ڈیڈی کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ میرا بیٹا یہاں تمہارے پاس ہے؟''

''ہاں۔ لیکن وہ میرے پاس آکر یہ دعویٰ نہیں کرسکتے تھے کہ میں بچے کو ان کے گھر سے لے کر آگئی ہوں اور اسے ان کی بیٹی نے جنم دیا ہے۔''

''ڈیڈی بدنامی سے بہت ڈرتے ہیں۔ وہ تمہارے پاس میرے بیٹے کو لینے نہیں آئے لیکن اسے مار ڈالنے کی کوئی چال ضرور چلیں گے۔ تم اس محلے میں اس شہر میں نہ رہو۔ لاہور چلی جاؤ۔''

''پھر تمہاری ماں چلی گئی۔ اسی شام تمہارے ابو آئے۔ انہوں نے کہا۔ ''میرے بیٹے کو لے کر ابھی لاری اڈے جاؤ اور لاہور جانے والی کسی بھی پہلی بس میں سوار ہو جاؤ۔ میں اس بس کے پیچھے اپنی کار میں آؤں گا۔ تم وہاں کسی علاقے میں مکان کرائے پر لوگی۔ میں وہاں آتا جاتا رہوں گا۔ تمہیں ہر ماہ رقم ملتی رہے گی۔''

''میں نے انہیں بتایا کہ میرا شوہر ایک لاکھ روپے کر فرار ہوگیا ہے۔ میں خالی ہاتھ رہ گئی ہوں۔''

انہوں نے مجھے پچاس ہزار روپے دیے اور میں لاہور آگئی۔ وہ اپنی کار میں میری بس کے ساتھ ہی آرہے تھے لیکن لاہور نہیں پہنچے۔ میں صبح تک انتظار کرتی رہی۔ تمہیں گود میں لیے سوچتی رہی کہ آخر تمہارے ابو کہاں رہ گئے؟

بہرحال میں نے یہاں یہ مکان کرائے پر لیا اور پورے بائیس برسوں سے اسی محلے میں ہوں۔ انہیں تلاش کررہی ہوں۔ یقیناً وہ بھی مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔''

وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''خدا جانتا ہے، ان سے کبھی ملاقات ہوسکے گی یا نہیں؟ اور تم خود دیکھ رہے ہو، میں نے ان کی امانت کس طرح سنبھال کر رکھی ہے۔''

کامران نے دایا نانی کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''آپ بہت اچھی ہیں۔ آپ نے ایک ماں کی طرح میری پرورش کی ہے۔ اب تو میں ہر نماز میں دعا مانگتا رہوں گا۔ یا اللہ! ایک بار مجھے امی ابو کی صورت دکھا دے۔''

زیتون سے تمام واقعات جان لینے کے بعد اسے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ لاوارث نہیں ہے لیکن دنیا والے تو یہی کہتے تھے۔

لاوارث کیا ہوتا ہے؟

وہ ''بیچارہ'' ہوتا ہے۔ جس کا کوئی اپنا تو کیا' کوئی دور پار کا رشتے دار بھی نہیں ہوتا۔ نہ کوئی آگے ہوتا ہے' نہ کوئی پیچھے رونے دھونے والا رہ جاتا ہے۔ وہ پوری دنیا میں سوکھے پتے کی طرح ہوا کے رحم و کرم پر ادھر سے اُدھر ہوتا رہتا ہے۔

لاوارث کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ گناہ کی پیداوار ہے۔ وہ محلے میں جہاں سے گزرتا تھا' لوگ اسے گری ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ کوئی بزرگ اس کے سر پر دستِ شفقت نہیں رکھتا تھا۔ کسی گھر کا دروازہ اسے خوش آمدید کہنے کے لیے نہیں کھلتا تھا۔

وہ بے چین تھا۔ اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا۔ کسی بھی طرح یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس کا وجود ناجائز نہیں ہے۔ اس کے والدین زندہ ہیں۔

لیکن کہاں ہیں؟ وہ کیسے یقین دلائے کہ وہ بھی دنیا والوں جیسا ہے۔ ان سے الگ، اچھوت اور قابلِ نفرت نہیں ہے۔

اس نے اسکول میں صرف دس جماعتیں پڑھی تھیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں موٹر گیراج میں کام کرتا تھا۔ وہاں سے ہفتے میں تین سو روپے ملتے تھے۔ ان میں سے کچھ دایا نانی کو دیتا تھا۔ کچھ اسکول کی فیس اور کتابوں میں خرچ ہوجاتے تھے۔ اس کے بعد کسی کالج میں قدم رکھنے کی اوقات نہیں تھی۔

اس کے باوجود اس نے اس سوتی جاگتی، دوڑتی بھاگتی اور بھگاتی ہوئی دنیا کی یونیورسٹی میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی تھی۔

اس دنیا میں لوگوں کو سمجھنے اور ان سے نمٹنے کے لیے شعوری طور پر جس علم اور ہنر کی ضرورت ہوتی ہے، وہ سب کچھ حاصل کرتا رہا تھا۔

یہ سچ ہے، انسان کے اچھے دن نہیں رہتے تو برے دن بھی نہیں رہتے۔ وہ بچپن سے جوانی تک فرہاد کی طرح پہاڑ کھودتا رہا تھا اور اب دودھ کی نہر نکلنے والی تھی۔ وہ مایوس ہونا نہیں جانتا تھا۔ ایک فقیر نے پیش گوئی کی تھی کہ اس کے دن بدلنے والے ہیں۔

سچے فقیر وہ ہوتے ہیں جو اپنی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے نام کردیتے ہیں۔ صرف اللہ سے مانگتے ہیں۔ دنیا کی ہر ضرورت کو مار ڈالتے ہیں۔ ایسے ہی ایک قناعت میں مست رہنے والے فقیر سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔

وہ رحمان پورہ موڑ سے متصل ایک آبادی میں اپنی دایا نانی کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ گھر سے کچھ ہی فاصلے پر فیروز پور روڈ پر جامعہ اشرفیہ مسجد تھی۔ اس کے دو بڑے گیٹ تھے۔ ایک گیٹ سڑک کی طرف جبکہ دوسرا نہر کی طرف کھلتا تھا۔ وہ اکثر وہاں نماز پڑھا کرتا تھا۔

وہ مسجد اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ اس کے فرش پر نماز پڑھتے وقت اس کے اندر عجیب سا روحانی سُرور پیدا ہوتا تھا۔ جی کرتا اس مسجد سے باہر نہ جائے لیکن دنیاوی معاملات اور اپنے حالات سے نمٹنے کے لیے عملی قدم اٹھانا پڑتا ہے۔

وہ گیراج جانے سے پہلے فجر کی نماز جامعہ اشرفیہ میں ادا کرتا۔ فیروز پور والے گیٹ سے اندر داخل ہوتا اور نہر کی جانب کھلنے والے گیٹ سے باہر نکل جاتا۔ صبح سویرے نہر کے کنارے تازہ ٹھنڈی فضا میں فرحت و تازگی محسوس کرتا۔

وہیں پر اس کی ملاقات فقیر بابا سے ہوئی۔ پتا نہیں، وہ کیوں صبح سویرے گیٹ کے سامنے پہنچ جاتا اور میلا سا کپڑا بچھا کر چند پرانی سی کتابیں اس پر سجا کر بیٹھ جاتا تھا۔ وہ بھی کسی کو آواز نہیں دیتا تھا کہ آؤ اور اپنی قسمت کا حال معلوم کرو...

ساری دنیا آنے والے کل کے متعلق جاننے کے لیے بے کل رہتی ہے۔ چند ایسے ہی لوگ اس کے پاس آتے تھے۔ کچھ معلومات حاصل کرتے پھر اس کے سامنے چند سکے پھینک کر چلے جاتے۔

عجیب بات تھی، لوگ اپنی زندگی.... اور مستقبل کے متعلق قیمتی معلومات حاصل کرتے اور اس کے عوض صرف چند سکے دیتے۔ وہ بھی خیرات کی طرح پھینک کر چلے جاتے تھے۔

کامران نے ایک بار دیکھا کہ ایک بیمار بوڑھا وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس فقیر بابا نے اپنے تمام سکے اٹھا کر اس بیمار کو دے دیے۔ سخی وہ ہے جو دکھی انسان کے لیے اپنی آخری پونجی بھی لٹا دیتا ہے اور ایسا اللہ والے ہی کیا کرتے ہیں۔

کامران کی جیب میں چند سکے ہوتے تھے۔ جو اس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے ناکافی ہوتے تھے۔ ایسے میں بھلا وہ اس فقیر بابا کو کیا دیتا؟ اس لیے سر جھکا کر اس کے سامنے سے گزر جاتا۔

قارئین متوجہ ہوں

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں، ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر آیات اور احادیث درج ہوں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

وہ حسبِ معمول ایک روز اس کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کی ہتھیلی مانگنے کے انداز میں پھیل گئی۔ اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے پہلی بار اسے ہاتھ پھیلائے دیکھا تھا۔ وہ بھی اس جیسے کنگال کے آگے... اس کا حلیہ ہی بتا دیتا تھا کہ وہ بھکاری نہ سہی، مفلس اور کنگال ضرور ہے۔

فقیر بابا نے اپنی ہتھیلی پھیلا کر کہا۔ ''ایک روپیہ دے گا تو ایک بات بتاؤں گا۔ جتنے روپے دے گا، اتنی باتیں بتاؤں گا۔''

فی زمانہ ایک روپے کی قدر بالکل ہی گھٹ گئی ہے۔ ایک روپیہ تو ایک نئے پیسے کے برابر ہوگیا ہے اور پیسے، آنے پائی کا حساب لوگ بھول چکے ہیں لیکن ایک فقیر منش کو مہنگائی سے کیا لینا...؟

اس نے ایک روپیہ طلب کیا تھا۔ کامران نے اس کے روبرو بیٹھ کر ایک روپیہ اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھ دیا پھر پوچھا۔ ''کیا بتاؤ گے؟''

بابا نے اس کا دایاں ہاتھ تھام لیا۔ لکیروں کی جانچ میں الجھ گیا۔ پھر سر اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تو لاوارث نہیں ہے۔''

یہ تو اسے معلوم ہوچکا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ اتنی بڑی دنیا میں وہ پہلا شخص تھا جو اسے بڑے یقین سے لاوارث نہیں کہہ رہا تھا۔

وہ بولا۔ ''یہ تو میں جانتا ہوں۔ جب اس دنیا میں آیا ہوں تو کوئی میری ماں ہوگی، کوئی میرا باپ ہوگا۔ اپنے علم سے تم یہ بتاؤ کہ میرے ماں باپ کون ہیں اور کہاں ہیں؟''

''میرا علم یہ نہیں بتا سکتا۔ ہاں۔ یہ بتا رہا ہے کہ تو جلد ہی ان سے ملے گا۔''

''خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔''

بابا نے اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دوسرا روپیہ دے۔ دوسری بات بتاؤں گا۔''

اس کا تجسس بڑھ گیا۔ فقیر بابا نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔ لاوارث ہونا اس کے لیے بہت بڑی گالی

تھی۔ یہ بات اسے اندر ہی اندر کچوکے لگاتی رہتی کہ اتنی بڑی دنیا میں اس کا وجود حرام ہے... والدین کے ملتے ہی سارے داغ دھبے دُھل جانے والے تھے۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک روپیہ نکالا اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بابا مسکرانے لگا۔ کامران نے پوچھا۔ ''مسکرا کیوں رہے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''جو کہوں گا، وہ تیرے لیے ناقابلِ یقین ہوگا لیکن سچ تو پھر سچ ہی ہے۔ تُو کروڑوں کی جائداد کا مالک ہے۔''

اس نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ اس کی حالت قبر کے اس مُردے جیسی تھی، جو اپنا حال خود ہی جانتا ہے۔ اس کی جیب میں صرف چند سکے تھے اور وہ اُسے کروڑ پتی ہونے کی نوید سنا رہا تھا۔

اب تک اس کی دونوں باتیں ہوائی تھیں۔ کامران کے نام کے ساتھ ایک فرضی ولدیت تھی۔ کیونکہ اس کے باپ کا پتا نہیں تھا۔ ماں بھی کہیں تاریکی میں گم تھی۔

اور وہ اسے کروڑ پتی بننے کے سبز باغ دکھا رہا تھا۔ جو سڑک چھاپ نجومی ہوتے ہیں، وہ لوگوں کی ایسی ہی ضروریات اور خواہشات سے کھیلتے ہیں۔

اس نے کامران کے قہقہے کی پروا نہیں کی۔ اپنا ہاتھ پھیلا کر سوال کیا۔ ''لا تیرا سکہ... ایک اور اہم بات بتاؤں گا۔''

کسی حد تک سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ اسے بڑے مزے سے لوٹ رہا ہے۔ اس نے مزید کچھ دینے سے معذرت چاہی۔ اسے ٹالنے کے لیے کہا۔ ''بس بابا! اور پیسے نہیں ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''تیری زبان سے جھوٹ اچھا نہیں لگتا۔ اگر تیری جیب میں ایک پیسہ بھی ہو تو خدا کا شکر ادا کر اور سچ بول دے۔ نہ دینا ہو، نہ دے مگر جھوٹ کبھی نہ بول۔ آج کے بعد تیری جیب خالی نہیں رہے گی۔''

یہ بھی انسان کی کمزوری ہے۔ سب ہی چاہتے ہیں کہ ان کی جیب کبھی خالی نہ ہو۔ وہ فقیر بابا ایسی ہی کمزوریوں سے کھیل رہا تھا۔

وہ درست کہہ رہا تھا۔ کامران کی جیب خالی نہیں تھی۔ اسے دو روپے دینے کے بعد جیب میں آٹھ روپے رہ گئے تھے۔ وہ ابھی اور ایک روپیہ نکال سکتا تھا۔

اس نے ایک روپیہ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بابا بولا۔ ''تیری زندگی میں ایک ہی چاہنے والی ہے۔ وہ تجھ سے بچھڑ گئی ہے۔''

اس نے گہری سانس لی۔ اس چاہنے والی کو اپنے اندر سمویا۔ ''ہائے میری جان فردا! کہاں ہو تم...؟''

وہ ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد گئی تھی اور ایک مہینہ گزر چکا تھا، واپس نہیں آئی تھی۔ اس کے گھر والوں نے چال چلی تھی۔ اسے کامران سے دور کرنے کے لیے کہا کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ اسلام آباد جا رہی ہے، مری اور ایوبیہ کی سیر کر کے واپس آ جائے گی۔

مگر اب ایک ماہ گزرنے کے بعد بھی نہیں آئی تھی۔ یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ اسے جبراً وہاں روکا گیا ہے۔ اسی لیے وہ ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔

اس نے پوچھا۔ ''مجھے وہ کب ملے گی؟''

''ملے گی... بہت جلد ملے گی لیکن...''

اس نے تڑپ کر پوچھا۔ ''لیکن کیا...؟ کیا پھر رکاوٹیں پیدا ہوں گی؟''

''ہاں... ملتے رہو گے، بچھڑتے رہو گے لیکن شادی...''

اس نے بے قرار ہو کر جلدی سے پوچھا۔ ''لیکن شادی کیا...؟ کیا شادی نہیں ہوگی؟''

''ہوگی مگر بہت ہی عجیب و غریب طریقے سے ہوگی۔ شاید ہماری دنیا میں ایسی شادی آج تک کسی کی نہیں ہوگی ہوگی۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''وہ شادی آخر کیسے ہوگی؟''

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ''میری معلومات کے آگے اندھیرا ہے۔ نہ میں جانتا ہوں، نہ اس سلسلے میں کچھ بتا سکوں گا۔''

''تم نے اب تک جتنی باتیں بتائی ہیں، وہ سب ناقابلِ یقین ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ تمہارے کہہ دینے سے کوئی معجزہ نہیں ہوگا۔ میرے ماں باپ اچانک ہی کہیں سے پیدا نہیں ہو جائیں گے۔ دوسری بات یہ کہ نہ میں کروڑ پتی بننے کا خواب دیکھتا ہوں، نہ مجھے تمہاری پیش گوئی سن کر خوشی ہو رہی ہے۔

اور تیسری بات... ایسا کون سا طریقہ ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے میری شادی عجیب و غریب کہلائے گی؟ تمہاری ساری باتیں قصے کہانیوں جیسی ہیں۔''

بابا نے کہا۔ ''ہتھیلی آگے بڑھا...''

کامران نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس نے تین

روپے پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھے پھر اس کی مٹھی کو بند کرتے ہوئے کہا۔ ''میری پہلی پیش گوئی درست ہو رہی ہے۔''

کامران نے وہ روپے اس کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں دی ہوئی رقم واپس نہیں لوں گا۔ ابھی میری جیب میں سات روپے ہیں۔ یہ خالی نہیں ہے۔''

اس نے روپے اپنی جیب میں رکھ کر پرانی کتابیں سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تو جب بھی آئے گا، میں یہیں ملوں گا۔ میری پیش گوئی درست نہ ہوئی تو اپنے تین روپے واپس لے جانا۔''

اس نے اٹھ کر زمین پر بچھے ہوئے کپڑے کو تہ کیا اور اپنی کتابیں اٹھا لیں۔ کامران نے کہا۔ ''میں نے تمہیں جھوٹا نہیں کہا ہے۔ تمہاری پیش گوئی کو قصے کہانیوں والی بات کہی ہے۔ تم شاید ناراض ہو گئے ہو؟''

وہ دونوں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے تھے۔ ان کے درمیان صرف ایک گز کا فاصلہ تھا۔ وہ بولا۔ ''میں ناراض نہیں ہوں۔ تیری بہتری چاہتا ہوں۔ آج کا دن تجھ پر بھاری ہے۔ بہتر ہے، ظہر کی نماز گھر میں پڑھ۔ مسجد نہ جا، باہر نہ نکل...''

''کیا مجھے کوئی حادثہ پیش آ سکتا ہے؟ ویسے میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔''

''دشمن اندھیروں سے نکلتے ہیں۔ جب تک روشنی میں نہیں آتے، پہچانے نہیں جاتے۔''

اس نے چونک کر کہا۔ ''ہاں۔ یاد آیا فردا... میری فردا کے باپ نے ایک بار غصے سے کہا تھا، اپنی اوقات میں رہو، میری بیٹی کا پیچھا چھوڑ دو ورنہ حرام موت مرو گے۔''

''آخر ایک دشمن نکل آیا نا؟ ابھی کہہ رہا تھا، کوئی عداوت کرنے والا نہیں ہے۔''

''اس کے باپ نے غصے سے دھمکی دی تھی۔ ورنہ وہ بہت سیدھا سادہ شریف آدمی ہے۔''

اچانک ہی ایک کار تیز رفتاری سے آئی اور ان کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ پھر وہ ہوا جس کی وہ توقع نہیں کر سکتے تھے۔ اس کار سے تڑاتڑ دو فائر ہوئے۔ فقیر بابا کے حلق سے کراہ نکلی۔ وہ ایک سکے کی طرح اچھلا... سکہ اُچھلنے کے بعد زندہ ہاتھوں میں آتا ہے مگر وہ موت کی مٹھی میں چلا گیا۔

اس کے ہاتھوں سے کپڑا اور کتابیں چھوٹ کر اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ وہ زمین پر گر رہا تھا۔ کامران نے اسے تھام کر آرام سے لٹایا۔ اس کے دیدے پھیل گئے۔ وہ کلمہ پڑھنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے ہی دم نکل گیا۔

دور و نزدیک سے کتنے ہی لوگ دوڑے چلے آئے۔ ایک شخص فون کے ذریعے قریبی تھانے والوں کو واردات کے متعلق بتا رہا تھا۔ ایک آدمی کہہ رہا تھا۔ ''اس گاڑی والے نے نمبر پلیٹ پر کپڑا باندھ رکھا تھا۔''

دوسرے نے کہا۔ ''میں گاڑیوں کو دور سے پہچان لیتا ہوں۔ وہ ٹویوٹا کرولا تھی۔''

تھوڑی دیر بعد پولیس آ گئی۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا۔ کامران اور کئی چشم دید گواہوں نے تھانے جا کر اپنے اپنے بیانات لکھوائے۔

کامران کی آنکھوں کے سامنے اچانک ہی ایک قتل ہوا تھا۔ اس نے پہلے کسی کو گولی کھا کر اس طرح مرتے نہیں دیکھا تھا۔ اب دیکھا تو بالکل ہی گم صم سا ہو گیا۔

اسے یاد آ رہا تھا کہ موت سے چند لمحے پہلے فقیر بابا نے کہا تھا، آج کا دن تجھ پر بھاری ہے۔ گھر سے باہر نہ نکل...

اس نے سوچا۔ ''تعجب ہے، اس نے میرے متعلق پیش گوئی کی تھی اور اپنے بارے میں نہیں جانتا تھا کہ آج کا دن اس پر بھاری ہے۔''

اس نے اونہہ کے انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نجومی بس کھانے کمانے والے ہوتے ہیں۔ دوسروں کو زندگی اور موت کا حال بتاتے ہیں۔ مگر... ان کی بے خبری میں موت انہیں پکڑ لیتی ہے۔''

اور اس بابا کی موت کیسے ہوئی تھی؟ وہ ایک فقیر تھا۔ کوئی اس کے لہو کا حساب کرنے والا نہیں تھا۔ کوئی یہ معلوم نہیں کرے گا کہ ایک قیمتی کار والے کو ایک بھکاری سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ وہ کیوں اسے گولی مارتا ہوا کہیں گم ہو گیا تھا؟

شاید وہ کبھی پکڑا نہیں جائے گا لیکن امیر کی بندوق سے غریب کا قتل اپنے پیچھے کئی چیختے ہوئے سوالات چھوڑ گیا تھا۔ کامران ان سوالات کے جواب معلوم کرنے کے لیے بے چین تھا۔

کوئی بات تھی جو اسے بے چین کر رہی تھی۔

کیا یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ اس قتل کے پیچھے کیا راز ہے؟

ایک کنگال فقیر کے قتل کے پیچھے کوئی گہرا راز ضرور ہوگا۔ قانون کے محافظ بھی حیران ہوں گے۔ چشم دید گواہوں نے کہا تھا کہ گولیاں چلانے والا ٹویوٹا کرولا میں تھا اور اس فقیر کے پاؤں میں پھٹی ہوئی چپل بھی نہیں تھی۔

اچانک ہی کامران کی بے چینی نے اس کے اندر چیخ

کر کہا۔ ''وہ گولیاں فقیر بابا پر نہیں، اس پر چلائی گئی تھیں۔ نشانہ وہ تھا مگر گولیاں اس بیچارے کو لگ گئیں۔''

وہ چلتے چلتے ایک دیوار کے سائے میں رک گیا۔ پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ ''ایک فقیر سے کوئی دشمنی کیوں کرے گا؟''

دوسرا سوال پیدا ہوا۔ ''اور ایک مہنگی کار والا مجھے کیوں قتل کرنا چاہے گا؟''

فوراً ہی جواب ملا۔ اس کی محبوبہ فردا کا پورا خاندان قیمتی کاروں اور عالیشان کوٹھیوں والا ہے۔

کوئی پتھر سے نہ مارے میرے دیوانے کو...

اور اسی گھر سے دیوانے کو پتھر مارے گئے تھے۔ تقدیر اچھی تھی کہ نشانہ چوک گیا۔ پتھر کسی اور کو جا لگا۔

وہ دیوار کے سائے سے پھر دھوپ میں آگیا۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگا۔ ''کیا فردا کے باپ نے محض دھمکی نہیں دی تھی؟ آج سچ مچ دھماکا کر دیا تھا؟''

''ہائے فردا! اگر یہ سچ ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے، میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اب ہمارا عشق آگ اور بارود سے کھیلنے والا ہے۔''

☆☆☆

وہ حسین بھی تھی اور دلنشین بھی۔ بلور جیسی جگمگاتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ نام اس کا فردا جمال تھا۔ فردا کے معنی ہیں۔ ''آئندہ، پھر بھی...'' یعنی طلب گاروں کو آج مل ہی نہیں سکتی۔ وہ وعدۂ فردا تھی۔ پھر بھی ہاتھ آئے گی۔

وہ ماں باپ کی لاڈلی بیٹی تھی۔ ضدی ایسی تھی کہ کسی جائز بات پر اڑ جاتی تو اسے منوا کر ہی رہتی۔ اس کے اور بھی بہن بھائی تھے۔ لیکن اس کے حسن اور ذہانت کے آگے سب ہی احساسِ کمتری میں مبتلا رہتے تھے۔

چچا زاد، پھوپھی زاد، ماموں زاد اور خالہ زاد اس سے شادی کرنا چاہتے تھے لیکن وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔

اس کی ممی نے کہا۔ ''ہمارے خاندان میں سب ہی خوبرو اسمارٹ لڑکے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ کسی کو تو پسند کر لو۔''

وہ ناک چڑھا کر بولی۔ ''یہ سب گھر کے مرغے دال برابر ہیں۔''

''تمہارا تو مزاج ہی نہیں ملتا۔ چلو گھر کے نہ سہی، باہر کے کسی خاندانی لڑکے کو پسند کرو۔ تمہاری شادی ہوگی تو دوسری بہنوں کی باری آئے گی۔''

''پلیز۔ میرا انتظار نہ کریں۔ میں اپنے آئیڈیل کی تلاش میں ہوں۔''

''لڑکیاں جیسا سوچتی ہیں، ویسا بر نہیں ملتا پھر جیسا بھی ملتا ہے، اس کے ساتھ گزارا کر لیتی ہیں۔''

''ممی! آپ جانتی ہیں، حالات مجھے مجبور کرتے ہیں اور نہ میں مجبور ہو کر حالات سے سمجھوتا کرتی ہوں۔''

''آئیڈیل مل چکا ہے یا ابھی تلاش کر رہی ہو؟''

''وہ ایک بار گورنمنٹ ہائی اسکول کے گیٹ پر دکھائی دیا تھا۔ میں قریبی جنرل اسٹور کے سامنے کار میں بیٹھی آئسکریم کے مزے لے رہی تھی۔ کسی نے اسے پکارا کامران...!''

وہ چپ ہو گئی۔ خیالوں میں کھو گئی۔ ماں نے پوچھا۔ ''وہ کون تھا؟ کس خاندان سے تعلق رکھتا تھا؟ تم نے اس سے بات کی تھی؟''

''اس روز تو میں اسے دیکھتی رہ گئی۔ سوچ میں پڑ گئی کہ وہ سب سے الگ' سب سے اچھا کیوں لگ رہا ہے؟ وہ کسی فلمی ہیرو کی طرح خوبرو اور اسمارٹ نہیں تھا۔ پھر بھی اچھا لگ رہا تھا۔''

اس نے ذرا ٹھہر کر کہا۔ ''میں گھر آ کر بھی اس کے خیالوں میں کھوئی رہی۔ پہلے کبھی دماغ میں کوئی اس طرح نہیں سمایا تھا۔ نیند آنے سے پہلے وہ کروٹ کروٹ میرے پاس آتا رہا۔ تب میں نے مان لیا کہ وہی میرا آئیڈیل ہے اور وہ صرف میرے لیے پیدا ہوا ہے۔''

ماں چپ چاپ اس کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔ ''دوسرے دن میں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش کی کافی تگ و دو کے بعد پتا چلا کہ وہ یہاں مارک شیٹ لینے آیا تھا۔

ہر ایک سے اس کا پتا پوچھنا مناسب نہیں تھا۔ دوسرے دن میں یہاں سے بوڑھے ملازم کو ساتھ لے گئی۔ اسے سمجھایا کہ اسکول کے آفس میں جا کر اسے کیا کہنا ہے؟

اس نے اسکول کے آفس میں جا کر ہیڈ ماسٹر سے کہا کہ وہ کامران کا چاچا ہے۔ بہت عرصے بعد گاؤں سے ملنے آیا ہے۔ اسے اپنے بھتیجے کا پتا چاہیے۔

یوں اس نے پتا معلوم کیا۔ میں اس ملازم کے ساتھ اس کے گھر تک آئی۔ پھر ملازم سے کہا کہ وہ جائے اور کامران کو بلا کر لائے۔''

اس کی ماں نے کہا۔ ''اس نے ابھی میٹرک کیا ہے اور تم کالج میں پڑھ رہی ہو۔ یقیناً وہ عمر میں تم سے کم ہوگا۔ کیا یہ فرق تمہیں اس کے بارے میں سوچنے سے روک نہیں رہا؟''

''نہیں ممی! مجھے وہ کم عمر نہیں لگا۔ پہاڑ جیسا تھا۔ اگرچہ جی بھر کر دیکھا نہیں ہے پھر بھی میرے حواسوں پر چھا گیا ہے۔''

ماں نے منہ بنا کر کہا۔ ''وہ گورنمنٹ اسکول میں پڑھتا ہے۔ اس کا مطلب ہے، بہت ہی غریب ہے۔ پھر وہ جس علاقے میں رہتا ہے وہاں مڈل کلاس لوگ رہتے ہیں۔ تم اس کے لیے اتنی باؤلی ہو گئیں کہ اس کے گھر تک پہنچ گئیں؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟''

''دماغ ہی تو ٹھیک نہیں ہے ممی! آپ نے ایک بار اپنے عشق کی داستان سنائی تھی کہ کس طرح میرے پاپا کے لیے دیوانی ہو گئی تھیں۔ جبکہ پاپا خاندانی رئیس ہیں اور آپ بھگوان پورہ کے ایک کچے مکان میں رہتی تھیں۔''

ماں اسے گھور کر رہ گئی اور بولی۔ ''آنکھیں نہ دکھائیں۔ عشق پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ جو آپ نے کیا، وہ آپ کی بیٹی کر رہی ہے۔''

''پہلے کی بات اور تھی۔ اب ہمارا اسٹیٹس ہمارا مان مرتبہ بڑھ گیا ہے۔''

''آپ میرا ساتھ دیں گی تو ہم کامران کو اپنی سطح پر لے آئیں گے۔''

''ہرگز نہیں۔ تم نچلی سطح کے ایک لڑکے کو شریکِ حیات بناؤ گی تو میری دو بیٹیوں کا کیا ہوگا؟ سب تھو تھو کریں گے۔''

''جو ایسا کرے گا، میں اس پر تھوک دوں گی۔''

ماں نے غصے سے کہا۔ ''میں آج تمہارے پاپا سے بات کروں گی۔ کہاں ہے وہ لڑکا...؟''

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ''وہ اپنے گھر میں نہیں تھا۔ اس کی نانی نے بتایا، وہ ملازمت کی تلاش میں کراچی گیا ہے۔ پتا نہیں کب تک واپس آئے گا؟''

وہ آہ بھرنے کے انداز میں سانس لے کر بولی۔ ''چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ اگر ایک اور مہینے وہ نہ آیا تو میں کراچی چلی جاؤں گی۔''

''کیا تمہارا دماغ خراب ہے؟ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔''

''وہاں آپ کی بڑی آپا، میری خالہ جان رہتی ہیں۔ وہ بھی مجھے بہو بنانا چاہتی ہیں۔ ابھی ایک کال کروں گی تو لینے آجائیں گی۔''

ماں اسے باتیں سنانے لگی۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس خاندان کے تمام لڑکے اور لڑکیاں آزاد خیال تھے۔ بزرگوں کی موجودگی میں بوائے فرینڈز اور گرل فرینڈز کے ساتھ ہنستے بولتے تھے۔

اس کے پاپا جمال جمشید نے سمجھایا۔ ''پاپا کی جان! وہ لڑکا اچھا لگتا ہے تو صرف دوستی کرو۔ اسے شریکِ زندگی بنانے کی غلطی نہ کرو۔''

فردا نے پوچھا۔ ''آپ نے ممی کو لائف پارٹنر بنانے کی غلطی کیوں کی ہے؟ آپ کی دولت عزت اور شہرت کے سامنے ممی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔''

''بیٹی! عورت پانی کی طرح ہوتی ہے۔ اسے جس برتن میں ڈالو اسی میں ڈھل جاتی ہے۔ لیکن وہ لڑکا ہے، ہمارے ماحول میں ڈھلنے کے باوجود مخمل میں ٹاٹ کا پیوند دکھائی دے گا۔''

''میں مخمل نہیں پہنوں گی۔ ٹاٹ پہن کر رہوں گی تو پیوند دکھائی نہیں دے گا۔''

''تم بچپن سے ایسی ہی ضدی ہو۔''

''اور آپ بچپن سے میری ضدیں پوری کرتے آئے ہیں۔''

وہ مسکرانے لگا۔ فردا آگے بڑھ کر باپ کے گلے لگ گئی۔ ماں نے کمرے میں آ کر دیکھا تو جل بھن کر رہ گئی۔ جمال سے بولی۔ ''اس کا مطلب ہے، آپ نے بیٹی کی بات مان لی ہے؟''

وہ بولا۔ ''فریدہ! تم بھی مان جاؤ۔ میں اس لڑکے کو بہت بڑا بزنس سیٹ اپ دوں گا تو وہ ہمارے برابر کا ہو جائے گا۔''

''میں نے آپ کو سمجھایا تھا، اسے جواد کے لیے راضی کریں۔ میرے بھائی کا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے۔''

فردا نے کہا۔ ''اور میں جسے چاہتی ہوں، وہ ساری دنیا میں ایک ہے۔''

جمشید نے کہا۔ ''ویسے فردا! یہ عجیب سی بات ہے۔ تم کہہ رہی ہو، وہ لڑکا تمہیں جانتا نہیں ہے۔ اس بیچارے کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ تم اسے چاہنے لگی ہو اور اس کا انتظار کر رہی ہو۔''

فریدہ نے کہا۔ ''وہ کام دھندے کے لیے کراچی گیا ہے۔ اللہ کرے اسے نوکری مل جائے۔ پھر کبھی ادھر نہ آئے۔ کسی سے شادی کر کے وہیں رہ جائے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''فردا کے نقطۂ نظر سے یہ ایک بددعا ہے۔ لیکن ایک بے روزگار نوجوان کے لیے دعا ہے۔ فردا! تم جاؤ' میں تمہاری ممی کو سمجھا لوں گا۔''

وہ ماں کو دیکھتے ہوئے فاتحانہ انداز میں مسکراتے

ہوئے وہاں سے چلی گئی۔

جمشید نے اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر فریدہ کے پاس آ کر دھیمی آواز میں بولا۔ ”میں نے بیٹی سے کہا ہے، جب وہ لڑکا آئے تو اسے میرے آفس بھیج دے۔ میں تنہائی میں اس سے بات کروں گا۔“

”آپ کیا بات کریں گے؟“

”اسے دھمکی دوں گا کہ وہ میری بیٹی سے دور چلا جائے۔ نہیں مانے گا تو اس کی زندگی مختصر ہو جائے گی۔“

فریدہ خوش ہو گئی۔ جمشید نے کہا۔ ”فکر نہ کرو۔ ہم بڑی خاموشی اور رازداری سے اس لڑکے کو دودھ کی مکھی طرح نکال پھینکیں گے۔ فردا کو یہی تاثر دیں گے کہ اس کی پسند، ہماری پسند ہے اور ہم اسے داماد بنانے والے ہیں۔“

فردا کے بہت سے کزنز تھے۔ سب ہی اسے شریک حیات بنانا چاہتے تھے۔ ان میں ماموں زاد جواد اور پھوپھی زاد شمشاد اسے حاصل کرنے کے لیے کچھ زیادہ ہی جنونی ہو رہے تھے۔ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ کامران ان کے راستے سے نہیں ہٹے گا تو موت اسے ہٹا کر راستہ صاف کر دے گی۔

شمشاد نے کہا۔ ”اس کے بعد بھی ایک مسئلہ رہے گا۔“

جواد نے پوچھا۔ ”وہ کیا۔۔۔؟“

وہ بولا۔ ”تم بھی فردا کو چاہتے ہو، میں بھی اس کی طلب سے باز نہیں آؤں گا۔ یوں ہم دونوں آج بھی ایک دوسرے کے رقیب ہیں، کل بھی رہیں گے۔“

”ہاں۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ ابھی ہم بھائی ہیں، دوست ہیں۔ کل دشمن بن سکتے ہیں۔“

شمشاد نے کہا۔ ”بہتر ہے، ہم دشمنی سے پہلے ہی دوست بن کر آپس میں سمجھوتا کر لیں۔“

”سمجھوتا تو یہی ہوگا کہ ہم میں سے کوئی ایک اس کی طلب سے باز آ جائے۔“

وہ ایک دوسرے کا منہ تکتے ہوئے سوچنے لگے۔ پھر جواد نے کہا۔ ”سچ پوچھو تو مجھے فردا پر حیرت ہے۔ اس نے ایک کمتر جوان کو ہم پر ترجیح دی ہے۔ ہماری توہین کی ہے۔“

شمشاد نے کہا۔ ”یہی بات میرے دل میں بھی ہے۔ وہ ہمیں ٹھکرا کر باہر والے کو لفٹ دے رہی ہے۔ میں بھی اسے ٹھکرانا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک بار حاصل کرنے کے بعد۔۔۔“

”میں بھی انتقام لینا چاہتا ہوں مگر پہلے حاصل کروں گا۔ اس کی خوب صورتی ہر وقت بے کل رکھتی ہے۔“

”وہ ہماری کزن ہے۔ اپنے خاندان کی لڑکی کو اغوا نہیں کر سکتے۔ کبھی بات کھلے گی تو پورا خاندان ہمارا مخالف ہو جائے گا۔ اسے بڑی ہیرا پھیری سے حاصل کرنا ہوگا۔“

”جب کامران اس دنیا میں نہیں رہے گا تو وہ ہم میں سے کسی ایک سے شادی کے لیے راضی ہو جائے گی۔“

شمشاد نے کہا۔ ”فرض کرو، وہ مجھ سے شادی کر لیتی ہے تو کیا تم مجھ سے دشمنی کرو گے؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”نہیں۔ تم تو اسے انتقاماً حاصل کر کے چھوڑ دو گے۔ طلاق دو گے تو میں اسے محبت سے ٹریپ کروں گا۔ اس سے شادی کروں گا۔ سہاگ رات مناؤں گا، پھر کسی اور کزن کے لیے طلاق دے دوں گا۔“ وہ انتہائی عیاری سے اپنے عزائم بتانے لگا۔

”اس مغرور لڑکی کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔ جب وہ بازاری عورت کی طرح استعمال ہوتی رہے گی تو اس کا تمام غرور خاک میں مل جائے گا۔“

ایک انار سو بیمار۔۔۔ اور وہ تمام بیمار سازشی تھے۔ فردا بے خبر تھی۔ اس کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ اس کے کزنز رقابت کی آگ میں جھلس رہے ہیں۔ ناکامی کی صورت میں اغوا اور قتل جیسی واردات سے بھی گریز نہیں کریں گے۔

وہ کم ظرف رشتے داروں سے بے خبر بڑی بے صبری و بے چینی سے کامران کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ طے کر چکی تھی کہ وہ ایک ماہ کے اندر کراچی سے واپس نہیں آئے گا تو خود وہاں جائے گی۔ اپنی خالہ کے پاس رہے گی اور اسے تلاش کرے گی۔

ایک روز وہ کالج سے واپس آ رہی تھی کہ راستے میں کار خراب ہو گئی۔ اتفاق سے قریب ہی ایک گیراج تھا۔ وہ وہاں آئی تو دو چار پرانی گاڑیوں کے درمیان ایک شخص کی جھلک نظر آئی۔ وہ ایک گاڑی کے نیچے لیٹا اس کی مرمت کر رہا تھا۔

وہ گاڑی کے۔۔۔۔ قریب آ کے جھکتے ہوئے بولی۔ ”اے سنو! میری کار میں کچھ خرابی ہو گئی ہے۔ وہ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہے۔ پلیز۔ چل کر دیکھ لو۔“

وہ بولا۔ ”دو کاریگر نماز پڑھنے گئے ہیں۔ کام زیادہ ہے۔ آپ کو انتظار کرنا ہوگا۔“

وہ بولی۔ ”کوئی بڑی خرابی نہیں ہے۔ پانچ دس منٹ میں ٹھیک کر دو گے۔“

”سوری۔ یہ کام چھوڑ نہیں سکتا۔ میں نے کہا نا، انتظار کریں۔“

وہ گاڑی کو لات مارتے ہوئے بولی۔ ”کیا تم لیڈیز فرسٹ کا اصول نہیں جانتے؟ کیا عورتوں کی طرح منہ چھپا رہے ہو؟ باہر نکلو۔“

اس نے زمین پر کھسکتے ہوئے کار کے نیچے سے ایک ذرا سر نکال کر اسے دیکھا۔ پہلی نظر میں یوں لگا آسمان کی حور ہے، ابھی ابھی زمین پر آئی ہے۔

فردا اسے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑی۔ اگرچہ اس کے کپڑوں پر اور منہ پر کالک لگی ہوئی تھی۔ پھر بھی اس نے پہچان لیا۔ حیرانی سے کہا۔ ”ہائے کامران! یہ تم ہو؟“

وہ بڑے تعجب سے بولا۔ ”ہاں۔ میں ہی کامران ہوں۔“

وہ بہت خوش تھی۔ ہنس ہنس کر بتانے لگی۔ ”میں نے سفید بادلوں کے درمیان لوحِ مقدر پر تمہیں دیکھا تھا۔ تم نے اپنا نام بتایا تھا اور کہا تھا، زمین پر آ کر ڈھونڈو۔ پھر یہ پہچان بتائی تھی کہ تمہارے منہ پر کالک لگی ہوگی۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں ابھی منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔“

وہ گاڑی کے نیچے سے نکل آیا۔ وہ بولی۔ ”لڑکی کو دیکھ کر صورت نکھارو گے۔ حلیہ درست کرو گے۔ ابھی کہہ رہے تھے، کام بہت ہے۔ گاڑی کے نیچے سے نکل نہیں رہے تھے؟“

”تم نے مجھے کام چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ تمہاری طرح میں نے بھی سفید بادلوں کے درمیان لوحِ مقدر پر تمہیں دیکھا تھا۔ تم نے اپنا نام بتایا تھا اور کہا تھا، گاڑی کے نیچے سے نکلو میں آ رہی ہوں۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو؟“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔“

”کیا تم نے مقدر کی تختی پر مجھے دیکھا تھا؟“

”ہاں، دیکھا تھا۔“

”کیا میں نے اپنا نام بتایا تھا؟“

”ہاں، بتایا تھا۔ تمہارا نام فردا جمال ہے۔“

یہ کہہ کر وہ گیراج کے ایک کمرے کی طرف جانے لگا۔ وہ حیرانی سے پیچھے پیچھے آتے ہوئے بولی۔ ”لوحِ مقدر والی بات مذاق تھی۔ اب مذاق ختم کرو۔ سچ بتاؤ، میرا نام کیسے جانتے ہو؟“

وہ واش بیسن پر جھک کر منہ ہاتھ دھوتے ہوئے بولا۔ ”پہلے تم بتاؤ، تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟“

وہ بتانے لگی کہ اسکول کے گیٹ پر اسے پہلی بار دیکھا تھا اور اس کا نام سنا تھا۔ وہ اسے اچھا لگا۔ اس سے دوستی کرنا چاہتی تھی۔ اسے تلاش کرتی ہوئی اس کے گھر تک پہنچ گئی تھی۔

اس نے حیرانی اور بے یقینی سے پوچھا۔ ”کیا میں ایسا ہوں کہ مجھ سے دوستی کرنے میرے دروازے تک آ گئیں؟“

”دوستی نہیں، محبت۔۔۔ مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا، نوکری کی تلاش میں تم کراچی گئے ہو۔“

”ہاں۔ مجھے ایک اچھی نوکری مل گئی تھی مگر وہاں دل نہیں لگا۔“

”یہاں میں دل لگا رہی تھی اس لیے وہاں دل نہیں لگا۔ دیکھو میں صاف اور سیدھی بات کرنے والی لڑکی ہوں۔ جو میرے دل میں ہوتا ہے، وہ زبان پر آ جاتا ہے۔ تم بہت اچھے ہو۔ میرے خیالی آئیڈیل سے لاکھ درجے بہتر ہو۔“

وہ منہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ اس کی بے باکی اور صاف گوئی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”اگرچہ یہ پہلی ملاقات ہے۔ مگر میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ اب تم بتاؤ میں تمہیں کیسی لگی؟“

وہ تولیے سے منہ ہاتھ پونچھتے پونچھتے رک گیا۔ اسے بڑی محویت سے دیکھنے لگا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اچھی طرح دیکھ لو بعد میں کوئی عیب نکالو گے تو اچھا نہیں ہوگا۔ میں جو کام کرتی ہوں ڈنکے کی چوٹ پر کرتی ہوں۔ میرا خاندان دور تک پھیلا ہوا ہے۔ اور میں اعلان کر چکی ہوں کہ تم میرے آئیڈیل ہو اور تم سے شادی کرنے والی ہوں۔“

وہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم لڑکی ہو یا طوفان میل؟ تمہیں یہاں آئے ہوئے پندرہ منٹ ہوئے ہیں۔ اتنی سی دیر میں تم نے مجھ سے محبت بھی کر لی اور شادی بھی کرنا چاہتی ہو۔“

”پندرہ منٹ۔۔۔؟ نہیں کامران! میں تو جیسے صدیوں سے تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ چھ ماہ پہلے ایک بار تمہیں دیکھا تھا، تب سے بار بار دیکھنے کی تمنا دل میں مچلتی رہی۔ تم اس دنیا کی بھیڑ میں کہیں کھو گئے تھے۔“

وہ بڑے جذب سے بول رہی تھی اور وہ سحر زدہ سا ہو کر سن رہا تھا۔ فردا نے ذرا رک کر کہا۔ ”مگر اب میں تمہیں کہیں گم ہونے نہیں دوں گی۔ محبت کی ہے شادی بھی تم سے کروں گی۔ تم اسے میری ضد کہہ سکتے ہو مگر یہ میرے پیار کی شدت ہے۔“

”تمہیں یہ تو معلوم کرنا چاہیے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں یا نہیں؟ میں تم سے شادی کروں گا یا نہیں؟“

”نہیں کرو گے تو میں تمہارا کیا بگاڑ لوں گی؟ اپنی

قسمت کا ماتم کروں گی۔ تمہاری گلی کے چکر کاٹتے ہوئے زندگی گزار دوں گی لیکن تمہارے سوا کسی کا نام زبان پر نہیں لاؤں گی۔“

”نام...؟“

وہ چونک کر بولی۔ ”ارے ہاں۔ تم نے بتایا نہیں، میرا نام کیسے جانتے ہو؟“

اس نے اپنی جیب سے اس کا شناختی کارڈ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح تمہارا نام جانتا ہوں۔“

وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”میرا آئی ڈی کارڈ تمہارے پاس کیسے آگیا؟“

”تمہارے پرس کی زپ کھلی ہوئی ہے۔ وہاں گاڑی کے پاس یہ گرا ہوا تھا۔ پتا نہیں، راستے میں اور کیا کچھ گراتی آئی ہو؟ اپنا پرس چیک کرلو۔“

اس نے پرس دیکھا۔ اندر ہاتھ ڈال کر ٹٹولا پھر کہا۔ ”یہ کارڈ اوپر ہی رکھا ہوا تھا اس لیے گر پڑا۔ باقی تمام چیزیں ہیں۔“

وہ پرس بند کرتے ہوئے بولی۔ ”ارے ہاں۔ کارڈ سے یاد آیا۔ تم مجھ سے کچھ نہیں تو دو تین سال بڑے ہوگے۔ مگر ابھی تک اسکول میں پڑھ رہے تھے، کیا ہر کلاس میں دو دو سال گزارے ہیں؟“

وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”تم درست کہہ رہی ہو۔ میں عمر میں تم سے بڑا ہوں لیکن میری غربت کی عمر مجھ سے بھی بڑی ہے۔ کبھی یہ پڑھنے کی اجازت دیتی تھی، کبھی تعلیم کا راستہ روک لیتی تھی اسی لیے اس عمر میں میٹرک کیا ہے۔“

”یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تم نے ایسے حالات میں بھی تعلیم کو چھوڑا نہیں۔ دیر سے ہی سہی، میٹرک تو کرلیا۔“

پھر اس نے جائے نماز بچھاتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تمہاری گاڑی چیک کرتا ہوں۔ ذرا انتظار کرلو۔“

وہ ایک جگہ کرسی پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔ اسے ان لمحات میں ایسی خوشی اور آسودگی مل رہی تھی جو منزل کو پالینے کے بعد ملتی ہے۔

وہ سوچ رہی تھی کہ سب سے پہلے اسے اپنے پاپا سے ملائے گی۔ پھر ممی اور دوسرے رشتے داروں سے متعارف کرائے گی۔ لیکن...

وہ اسے سر سے پاؤں تک دیکھنے لگی۔ ”آدمی اپنے لباس سے پہچانا جاتا ہے، اپنے پہناوے سے دوسروں کو متاثر کرتا ہے۔“

اس نے ایک پرانا سا ٹراؤزر اور ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ اپنے گھر والوں کو متاثر کرنے کے لیے اس کا حلیہ بدلنا ضروری تھا۔

وہ نماز کے بعد دعا مانگنے لگا۔ ”یاخدا! میرے لیے بہتری فرما... تُو نے آسمان سے من و سلویٰ اتارا تھا۔ کیا میرے لیے یہ لڑکی اتاری ہے؟ یہ میرے دل کو لگ گئی ہے۔ لیکن میری اوقات سے بہت زیادہ ہے اور بہت زیادہ تُو ہی دیتا ہے۔ اگر یہ واقعی تیری رضا سے آئی ہے تو پھر میری زندگی میں رہے۔ واپس نہ جائے۔“

وہ اسے خوب نظر بھر کر دیکھ رہی تھی۔ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ ”اللہ کرے اس کا دل مجھ پر آجائے۔ نہیں آئے گا، تب بھی نہیں چھوڑوں گی۔ میں نے آج تک جو چاہا ہے، وہ حاصل کیا ہے۔ اسے بھی حاصل کرکے رہوں گی۔“

وہ مصلا اٹھا کر اسے تہ کرتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم نماز نہیں پڑھتی ہو؟“

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ کامران نے پوچھا۔ ”روزے رکھتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”جب کھانے کو مل رہا ہے تو بھوکے رہنا کونسی دانشمندی ہے؟“

کامران نے بڑے افسوس سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا کسی ڈاکٹر نے یا تمہارے گھر والوں نے یہ نہیں سمجھایا کہ کبھی پیٹ کو خالی رکھنا چاہیے، معدے کو آرام پہنچانا چاہیے؟“

”مجھے کبھی پیٹ کی کوئی بیماری نہیں ہوئی۔ ہمارے گھر میں پاپا کے سوا نہ کوئی روزہ رکھتا ہے نہ نماز پڑھتا ہے۔“

وہ حیرانی سے بولا۔ ”تعجب ہے۔“

”اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ جو غریب محتاج اور ضرورت مند ہوتے ہیں، کہیں مانگنے سے نہیں ملتا تو خدا سے مانگنے کے لیے روزے رکھتے ہیں اور نماز پڑھتے ہیں۔ ہماری ضرورتیں تو پلک جھپکتے ہی پوری ہوجاتی ہیں۔“

”میں سمجھ گیا۔ تم مسلمان گھرانے میں پیدا نہیں ہوئی ہو؟“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ میرے باپ دادا، پردادا سب ہی مسلمان تھے اور ہیں۔ میں بھی مسلمان ہوں۔“

”پھر تو تمہارے مسلمان ہونے کی کوئی پہچان ہوگی؟“

وہ سوچنے لگی پھر سر جھٹک کر بولی۔ ”یہ کیا بحث شروع کردی؟ تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

”یہ بحث نہیں ہے۔ تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کررہی ہو، شادی کرنا چاہتی ہو، میں تمہاری اسلامی شناخت چاہتا ہوں۔“

وہ چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”ہمارے گھر میں قرآن مجید ہے۔ میرے دادا جب زندہ تھے، اسے پڑھا کرتے تھے۔ اب پاپا پڑھتے ہیں۔ وہ نمازی ہیں۔ پورے روزے رکھتے ہیں۔ تمام بچوں کو نماز پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ میری دو بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ وہ جمعے کی نماز پڑھتے ہیں۔“

”اور تم...؟“

”میں نہیں پڑھتی۔ اب یہ نہ پوچھنا، کیوں نہیں پڑھتی؟ میں جھوٹ نہیں بولتی۔ جو سچ ہے، وہ کہہ دیا۔“

”تم ایک اچھی مسلمان لڑکی بن سکتی ہو۔ کیونکہ جھوٹ نہیں بولتی ہو۔“ پھر وہ باہر جاتے ہوئے بولا۔ ”چلو مجھے دکھاؤ، کار کہاں ہے؟“

وہ گیراج سے باہر آگئے۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک ہنڈا اکارڈ کھڑی تھی۔ کامران اسے چیک کرنے لگا۔ وہ بولی۔ ”تم ابھی میرے ساتھ چلو گے۔“

”گیراج میں بہت کام ہے۔ میں کہیں نہیں جاسکتا۔“

”یہ کام چھوڑ دو۔ پاپا تمہیں بزنس مین بنانا چاہتے ہیں۔“

”میں ان کا یہ احسان کیوں لوں؟“

”اس میں احسان کی کیا بات ہے؟ تم ان کے داماد ہوگے۔“

”یہ کس نے کہا؟“

”کیا...؟ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے؟“

اس نے محبت سے اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”تم بہت خوب صورت ہو۔ تمہاری طرف دل کھنچا جاتا ہے۔ لیکن...“

”جب میں خوب صورت اور پُرکشش ہوں تو لیکن کیا...؟ کیا کہنا چاہتے ہو؟“

اس نے کہا۔ ”میری شریکِ حیات وہ ہوگی جو نماز پڑھتی ہو، دین کے تمام احکامات کی پابندی کرتی ہو۔“

”یہ تو کوئی پرابلم نہیں ہے۔ ابھی کہو! میں ابھی نماز پڑھ لیتی ہوں۔“

”صرف دکھاوے کے لیے اور شادی کرنے کے لیے نہیں، دل سے نماز پڑھنی ہوگی۔“

”جب تمہیں دل دیا ہے تو دل سے پڑھوں گی۔ پوری سچائی سے عبادت کروں گی۔“

”کیا تم نے قرآن مجید پڑھا ہے؟“

''بچپن میں نانی کے پاس رہتی تھی۔ ان سے ایک سپارہ پڑھا تھا۔ دو تین سورتیں زبانی یاد کی تھیں۔ وہ سب بھول گئی۔''

''تو پھر نماز میں کیا پڑھوگی؟''

وہ سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔ ''تم مجھے سورتیں یاد کرا دینا۔ میری یادداشت زبردست ہے۔ فٹافٹ یاد کرلوں گی۔''

وہ مطمئن ہو کر بولا۔ ''تمہارا یہ جذبہ دیکھ کر گیراج سے چھٹی لینی ہوگی۔ تم اپنی گاڑی میں بیٹھو۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

''اسے ٹھیک کر کے تو جاؤ۔''

''معمولی سی خرابی تھی۔ دور ہو گئی۔''

وہ بولتا ہوا چلا گیا۔ فردا اسے جاتے ہوئے یوں دیکھتی رہی، جیسے اس کی طرف کھنچی جا رہی ہو۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ کار کی اگلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔

وہ ہنسنے بولنے اور میوزک کی دھن پر ناچنے گانے والی لڑکی تھی۔ اپنے آئیڈیل کے ساتھ لائف انجوائے کرنے والے بہت سے پروگرام بنا چکی تھی۔

اس نے سوچا تھا کامران کراچی سے آئے گا تو اسے جانے نہیں دے گی۔ اس کے ساتھ..... پیار بھری باتیں کرے گی اور بھرپور رومان پرور لمحات گزارے گی۔

لیکن وہ پہلی بار ملتے ہی نماز روزے اور دین ایمان کی باتیں کر رہا تھا۔ فردا کو مایوس ہونا چاہیے تھا مگر وہ خوش تھی۔ کیونکہ وہ بڑے انتظار کے بعد مل رہا تھا اور اسے کھونا نہیں چاہتی تھی۔

اس کے لیے یہ بہت تھا کہ اس کی آرزو پوری ہو رہی تھی۔ اس کا مطلوب، اس کا محبوب اسے مل گیا تھا۔ اب اس کے ساتھ رہنے والا تھا اور وہ طے کر چکی تھی کہ اس کے رنگ میں رنگ جائے گی۔

کامران جلد ہی واپس آ گیا۔ اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھ کر بولا۔ ''تم جہاں کہو گی چلوں گا لیکن عصر کی نماز کے وقت جدا ہو جاؤں گا۔''

''میں تو جدا نہیں ہوں گی۔ تم کسی بھی مسجد میں نماز پڑھ کر میرے پاس آ جاؤ گے۔''

''اور تم...؟ تم نے نماز پڑھنے کا وعدہ کیا ہے۔''

''ہاں۔ مگر اتنی جلدی آیتیں یاد نہیں کر سکوں گی۔''

''ابھی آدھے گھنٹے میں دو آیتیں یاد کرلو گی۔ ایک سورۃ فاتحہ اور ایک بہت ہی مختصر سی آیت ہے سورۃ اخلاص۔''

''ٹھیک ہے یاد کرلوں گی لیکن نماز پڑھنے کے لیے گھر جانا ہوگا۔ غسل کروں گی، لباس تبدیل کروں گی پھر نماز پڑھوں گی۔''

''اچھی بات ہے۔''

اس نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کہاں چلنا ہے؟''

''فی الحال انارکلی چلو۔ تمہارے لیے ایک درجن سوٹ، جوتے، جرابیں اور...''

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ''تم میرے لیے کیوں خریدو گی؟''

''اس لیے کہ تم میرے ہو چکے ہو۔ مجھے حق پہنچتا ہے کہ تمہیں شہزادہ سلیم بنا دوں۔''

''تم بھی میری ہو چکی ہو۔ میرا بھی فرض ہے کہ تمہیں انارکلی بنا دوں۔''

''جب میرے پاپا تمہیں بزنس مین بنا دیں گے، تب میں تم سے شاپنگ کے لیے لاکھوں روپے لیا کروں گی۔ ابھی مجھے اپنی خوشی پوری کرنے دو۔''

''جہاں تک تمہارے پاپا کے ذریعے بزنس مین بننے کا تعلق ہے، اس پر مجھے اعتراض نہیں ہے۔ کیونکہ میں کسی کا سہارا، کسی کا تعاون حاصل کر کے ہی اپنا بہتر مستقبل بہتر بنا سکتا ہوں۔ لیکن یہ نامناسب ہے کہ تم مجھے شاپنگ کراؤ۔''

''میں تمہاری بات مان رہی ہوں۔ دینی احکامات پر عمل کروں گی۔ تمہیں بھی میری بات ماننی ہوگی۔''

اس نے ہار ماننے کے انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ پہلے تم آیتیں یاد کرو۔ گھر جا کر نماز پڑھو۔ اس کے بعد شاپنگ ہوگی۔''

''اچھی بات ہے۔ مجھے پڑھاؤ۔''

وہ اسے سورۃ فاتحہ پڑھانے لگا۔ وہ پڑھتے پڑھتے بولی۔ ''یہ سورۃ تو نانی جان نے یاد کرائی تھی۔ تم ایک دو بار پڑھو، میں یاد کرلوں گی۔''

اس نے دو بار سورۃ پڑھائی۔ اس نے تیسری بار روانی سے سنا دی۔

کامران نے کہا۔ ''شاباش! تم نے مجھے خوش کیا ہے۔ خدا تم سے خوش ہوگا۔ اب اپنے گھر کا راستہ بتاؤ۔ وہاں پہنچنے تک سورۃ اخلاص بھی یاد کرلو گی۔''

اور یہی ہوا۔ اس نے اپنی کوٹھی کے قریب پہنچنے تک دو آیتیں اچھی طرح ذہن نشین کرلیں۔ کامران نے کہا۔ ''اب تم یہاں سے ڈرائیو کرتی ہوئی گھر جاؤ۔ میں نماز پڑھنے کے بعد اس سامنے والی مسجد کے باہر تمہارا انتظار کروں گا۔''

وہ کار سے اتر گیا۔ فردا ڈرائیو کرتی ہوئی اپنی کوٹھی کے پورچ میں آئی۔ اس کی ماں فریدہ بیگم دروازہ کھول کر باہر آ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''اتنی دیر کہاں لگا دی؟ مجھے چابی دو۔ میں ایک کام سے جا رہی ہوں۔''

''سوری ممی! آپ پاپا کی گاڑی لے جائیں۔ مجھے نماز پڑھنے ہی جانا ہے۔''

ماں نے حیرانی سے چیخ کر پوچھا۔ ''نماز...؟ تم نماز پڑھوگی؟''

وہ جواب دیے بغیر تیزی سے کوٹھی کے اندر آئی۔ ماں تو حیران رہ گئی۔ اس کے پیچھے دوڑتی ہوئی آئی۔ ''فردا! میں نے ٹھیک سنا ہے نا؟ تم نے نماز پڑھنے کی بات کی ہے؟''

''یس ممی! آپ کے کان بہت تیز ہیں۔ درست ہی سنا ہے۔''

فردا کا ماموں ایک کمرے سے نکل کر آ رہا تھا۔ فریدہ نے کہا۔ ''بھائی جان! آج اس لڑکی کو کیا ہوا ہے؟ یہ نماز پڑھنے جا رہی ہے۔''

ماموں جان نے پہلے حیرانی ظاہر کی پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... یہ تو اچھی بات ہے۔ ہم نے نہیں پڑھی، ہماری بھانجی پڑھ رہی ہے۔ کیا ایسے وقت کوئی دستور ہے؟ میرا خیال ہے، دیگیں پکوائی جائیں۔''

فریدہ نے کہا۔ ''پتا نہیں، ایسے وقت کیا کرتے ہیں؟ آپ داتا دربار فون کریں۔ وہاں دیگیں پک جائیں گی۔''

وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں آئی۔ وہاں جمال جمشید کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''سنتے ہیں جی!''

وہ ایک انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ ''چپ رہو۔ ضروری کال ہے۔''

''کیسے چپ رہوں؟ آج تو آپ کی لاڈلی نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ وہ اپنے کمرے میں نماز پڑھنے گئی ہے۔''

جمشید اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔ اس نے بھی تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔ ''نماز...؟ کیا فردا نماز پڑھ رہی ہے؟''

وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ فریدہ پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ باپ نے کمرے میں آ کر دیکھا۔ بیٹی نہیں تھی۔ ماں نے باتھ روم کا دروازہ کھولنا چاہا، وہ بند تھا۔ اس نے کہا۔ ''غسل کر رہی ہے۔ پاک صاف ہو رہی ہے۔ کیا اسے وضو کرنا آتا ہے؟''

''نہیں آتا ہوگا تو میں سکھا دوں گا۔ یہ باپ کی طرح نماز پڑھے گی۔''

موبائل فون سے کالنگ ٹون سنائی دی۔ فریدہ نے اسے آن کر کے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے فردا کی پھوپھی نے کہا۔ ''بھابی جان! یہ اچانک کیسے ہو گیا؟ ابھی آپ کے بھائی جان نے فون پر بتایا ہے، فردا نماز پڑھ رہی ہے؟ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔''

''میں بھی حیران ہوں۔ ابھی اسے نماز پڑھتے دیکھوں گی، وہ کیسی لگتی ہے؟''

''بھابی جان! فوراً کیمرا نکالیں۔ اس کی تصویریں اتاریں۔ یہ ایک چونکا دینے والا موقع ہے۔ ہم رشتے داروں کو مٹھائی کے ساتھ اس کی تصویریں بھی بھیجیں گے۔''

''تم نے اچھا مشورہ دیا ہے۔ میں تصویریں اتار کر دبئی اور کینیڈا بھیجوں گی۔ ابھی بھائی جان نے داتا دربار کے لنگر خانے میں دیگیں پکوانے کا آرڈر دیا ہے۔''

''میں مغرب کے وقت آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھوں گی، وہ نماز پڑھتی ہوئی کیسی لگتی ہے؟''

رابطہ ختم ہو گیا۔ جمشید نے پوچھا۔ ''کیا تم نے منت مانی تھی کہ بیٹی نمازی بن جائے؟''

''نہیں تو۔ میں نے کوئی منت نہیں مانی تھی۔''

''کیا ہمارے خاندان میں کوئی مر گیا ہے؟''

''خدا نہ کرے۔ کیوں کسی کے مرنے کی بات کر رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ تم دیگیں پکوا رہی ہو۔''

''اور کیا کرنا چاہیے؟ میری سمجھ میں جو آیا، وہی کر رہی ہوں۔''

''ذرا عقل سے کام لو گی تو سمجھ میں آئے گا کہ بیٹی نماز پڑھ رہی ہے تو ماں کو بھی پڑھنا چاہیے۔''

''رہنے دیں۔ میری بات چھوڑیں اور........

.... اپنی دوسری اولادوں کو نصیحت کریں۔''

فردا غسل سے فارغ ہو کر باتھ روم سے باہر آئی تو باپ نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر پوچھا۔ ''کیا واقعی تم نماز شروع کر رہی ہو؟''

''یس پاپا! کامران نے کہا ہے، میں نماز نہیں پڑھوں گی، دینی احکامات پر عمل نہیں کروں گی تو وہ شادی نہیں کرے گا۔ بس اب میں پانچوں وقت کی نماز پڑھا کروں گی۔ رمضان کا مہینہ قریب ہے، پورے روزے رکھوں

گی۔‘‘

باپ نے بیٹی کی پیشانی چوم کر کہا۔ ’’سبحان اللہ! میں جانتا ہوں، تم ارادے کی پکی ہو۔ آئندہ دینی احکامات پر عمل کرتی رہو گی۔ کامران کو یہاں بلاؤ، میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’کل اس کے ساتھ آپ کے آفس آؤں گی۔ آج اس نے دو سورتیں یاد کرائی ہیں اور بتایا ہے کہ عصر کی نماز میں چار رکعت سنت اور چار رکعت فرض ادا کی جاتی ہیں مگر یہ پوچھنا بھول گئی کہ وضو کیسے کرتے ہیں؟‘‘

’’میں اپنی بیٹی کو سکھاتا ہوں... آؤ۔‘‘

وہ دونوں واش روم میں آگئے۔ فریدہ دروازے پر کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔ باپ نے آج تک بیٹی کی ہر ضرورت پوری کی تھی۔ بہت کچھ دیا تھا اور آئندہ بھی دینے والا تھا لیکن دینی تعلیم نہیں دی تھی، وہ اب دے رہا تھا۔

اذان کے بعد باپ بیٹی نے ایک ہی کمرے میں نماز ادا کی۔ ایسے وقت فریدہ ان کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ماموں جان ڈیجیٹل کیمرے سے اس کی تصویریں اتار رہے تھے۔

فردا نے سلام پھیر کر مختصر سی دعا مانگی۔ ’’یا خدا! میں نادان تھی۔ کبھی تیرے سامنے سجدہ نہیں کیا۔ کبھی تجھ سے کچھ نہیں مانگا۔ پہلی بار مانگ رہی ہوں۔ کامران کو ہمیشہ کے لیے میری زندگی کا ساتھی بنا دے۔ آمین۔ یا خدا! ہماری شادی کرا دے۔ آمین۔‘‘

وہ دعا مانگتے ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ باپ سے بولی۔ ’’پاپا! میں جا رہی ہوں۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ میں مغرب کے وقت آؤں گی۔ پھر آپ کے ساتھ نماز ادا کروں گی۔‘‘

’’مغرب کے بعد تو نہیں جاؤ گی نا؟‘‘

’’جاؤں گی۔ عشاء کے بعد نہیں جاؤں گی۔ کل صبح اس سے ملوں گی۔ پھر اسے آپ کے آفس... لاؤں گی۔‘‘

وہ تیزی سے چلتی ہوئی باہر پورچ میں آکر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کی دونوں بہنوں نے پوچھا۔ ’’ہائے آپی! ہم مارکیٹ گئے تھے۔ یہاں آتے ہی معلوم ہوا، آپ نماز پڑھنے لگی ہیں؟‘‘

دوسری بہن فریال نے پوچھا۔ ’’کیا یہ سچ ہے؟‘‘

’’پاپا سے جا کر پوچھو۔ میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ میں چاہوں گی، تم دونوں بھی میرے ساتھ نماز پڑھا کرو۔‘‘

وہ کار اسٹارٹ کرکے تیزی سے ڈرائیو کرتی ہوئی مسجد کے سامنے آئی۔ کامران اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ گاڑی میں آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ’’کیا نماز پڑھی ہے؟‘‘

’’ہاں۔ پاپا کے ساتھ پڑھی ہے۔ وہ بہت خوش ہیں۔ انہوں نے مجھے پیار کیا اور دعائیں دی ہیں۔‘‘

وہ گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ’’میرے گھر میں تو تہلکہ مچ گیا ہے۔ ممی نے اور ماموں جان نے لنگر بانٹنے کے لیے دیگیں پکوائی ہیں۔ نماز پڑھتے وقت میری تصویریں اتاری گئی ہیں۔ جو دوسرے رشتے داروں کے پاس بھیجی جائیں گی۔‘‘

’’گھر میں اور کسی نے نماز نہیں پڑھی؟‘‘

’’نہیں۔ وہ بس ایک دوسرے کے ساتھ خوشیاں منا رہے ہیں۔‘‘

وہ بولا۔ ’’اسی طرح وہ روزے نہیں رکھتے ہوں گے مگر عید کی خوشیاں مناتے ہوں گے؟ جیسا کہ اکثر مسلمان کرتے ہیں۔‘‘

’’میں بھی یہی کرتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں نے پہلی بار نماز پڑھی ہے۔ کیا بتاؤں، کتنا اچھا لگ رہا ہے جب سجدے میں گئی تھی تو ایسا لگا، جیسے بدن کا سارا خون سجدہ کرنے کے لیے سر میں سمٹ آیا ہو۔ اگر پاپا ساتھ نہ ہوتے تو سجدے سے سر نہ اٹھاتی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔‘‘

یہ کہتے ہی وہ رونے لگی اور گاڑی کو سائڈ میں کرکے روک دیا۔ کامران نے سرشار ہو کر پہلی بار اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ’’فردا! میں بہت خوش ہوں۔ ایسی روحانی خوشی آج تک کسی نے نہیں دی۔ ہمارے درمیان پوری سچائی سے محبت پنپ رہی ہے۔ ہم مسلمانوں کو ایسا ہی رومانس کرنا چاہیے۔‘‘

وہ دوپٹے کا ایک کونا تھام کر اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ وہ بولی۔ ’’میں نے نماز قائم رکھنے کی نیت کی ہے تو تم مل رہے ہو۔ تم خدا کی طرف سے ملنے والا انعام ہو۔‘‘

’’میری ایک بات مانو، کل صبح شاپنگ کرو۔ ابھی باتیں کرتے کرتے نماز کا وقت ہو جائے گا۔‘‘

’’جو کہو گے، وہی کروں گی۔ فی الحال تمہارے پاس ایک موبائل فون ہونا چاہیے۔ عشاء کے بعد ہم بچھڑ جائیں گے تو فون پر بات کریں گے۔‘‘

وہ دل سے مجبور ہو گیا تھا، انکار نہ کرسکا۔ اس کا بھی جی چاہ رہا تھا کہ اس کی رس بھری آواز ہر وقت اس کے کانوں میں رس گھولتی رہے۔ بچھڑنے کے بعد بھی وہ اسے ستا رہی ہے۔

فردا نے ایک موبائل فون خرید کر اسے دیا۔ اس نے کہا۔ ’’میں گھر جا کر اسے چارج کرلوں گا پھر رات گیارہ بجے کے بعد ہم باتیں کرسکیں گے۔‘‘

’’عشاء کی نماز آٹھ بجے ہوتی ہے۔ ایک گھنٹے میں بیٹری فل ہو جائے گی۔ ہم دس بجے سے پہلے بات کریں گے۔‘‘

’’تم نماز کے بعد اپنے پاپا سے مزید سورتیں پڑھو گی۔ انہیں ازبر کرو گی۔ مجھے فون پر سناؤ گی۔ پھر ہم پیار بھری باتیں کریں گے۔‘‘

مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔ کامران اسی طرح کوٹھی کے قریب بچھڑ کر مسجد چلا گیا۔ فردا گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا، اس شہر میں رہنے والے تمام رشتے دار عورتوں بچوں سمیت وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی پھولوں کے ہار پہنانے لگے۔

وہ حیران ہو کر بولی۔ ’’یہ سب کیا ہو رہا ہے؟‘‘

اس کی خالہ نے کہا۔ ’’یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ڈرائنگ روم میں جا کر دیکھو۔‘‘

وہ ڈرائنگ روم میں آئی تو ہر سو رنگا رنگ غبارے دکھائی دیے۔ ایک بڑی سی میز پر کیک رکھا ہوا تھا۔ سب ایک ساتھ بول رہے تھے۔ ’’ہیپی ڈیلی نماز ٹو یو فردا ہیپی ڈیلی نماز ٹو یو...‘‘

وہاں جواد اور شمشاد کے علاوہ اور کئی طلب گار کزنز چپ کھڑے تھے۔ انہیں یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ کامران کے ساتھ گھوم پھر رہی ہے۔ ان کے ماں باپ بھی خوش نہیں تھے۔ اسے بہو بنانا چاہتے تھے اور وہ ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔

جمشید نے ان سب سے کہا۔ ’’کسی کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کامران کو ابھی داماد نہیں بنایا جا رہا ہے۔ ہم فردا کو پیار سے سمجھائیں گے۔ مجھے یقین ہے، وہ اپنی ضد سے باز آجائے گی۔ جب مان جائے گی تو پھر کامران کا منہ بھی نہیں دیکھے گی۔‘‘

وہ سب یہ سن کر کسی حد تک مطمئن ہوگئے کہ فریدہ اور جمشید معمولی لڑکے کو داماد بنانا نہیں چاہتے۔ مگر فردا کے طلب گار مطمئن نہیں تھے کیونکہ وہ کامران کے ساتھ وقت گزار رہی تھی۔

وہ تمام رقیب اپنی اپنی سوچ کے مطابق تصور کی آنکھ سے دیکھ رہے تھے کہ کامران ان کی چیز کو چھو رہا ہے، پکڑ رہا ہے، اپنی دھڑکنوں سے لگا رہا ہے اور پتا نہیں عشق و محبت کے کیسے کیسے مرحلوں سے گزر رہا ہے؟

وہ تمام رقیب چپ چاپ انگاروں پر لوٹ رہے تھے۔ لیکن خاموش رہنے والے نہیں تھے۔ کچھ کر گزرنے کے لیے بے چین و بے قرار تھے۔

وہ نماز سے فارغ ہوتے ہی گھر سے نکلنے لگی۔ اس کی چچی نے کہا۔ ’’کہاں جا رہی ہو؟ یہاں آؤ اور کیک کاٹو۔‘‘

’’ابھی واپس آتی ہوں، عشاء کی نماز کے بعد آپ لوگوں کے ساتھ انجوائے کروں گی۔‘‘

اس نے کار اسٹارٹ کی۔ ماموں نے کہا۔ ’’یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تم اس لڑکے کی خاطر ہمیں نظر انداز کر رہی ہو۔‘‘

اس نے جواباً خاموشی سے کار آگے بڑھا دی۔ رفتار تیز کرتی ہوئی احاطے کے گیٹ سے باہر نکل کے نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ماموں اور پھوپھی جھنجلا کر رہ گئے۔

ماموں نے کہا۔ ’’یہ میری بہن کی بیٹی نہ ہوتی تو ایک ہی تھپڑ میں سیدھی کر دیتا۔‘‘

پھوپھی نے کہا۔ ’’یہ میرے بھائی کی بیٹی نہ ہوتی تو میں اسے غنڈوں سے اٹھوا لیتی۔ سارے ناز نخرے اور غرور بھول کر قدموں میں پڑی رہتی۔‘‘

چچی نے کہا۔ ’’سمجھنے کی بات یہ ہے کہ یہ دن بھر اس لڑکے کے ساتھ رہی۔ کیا لڑکے کے گھر جاتی ہے؟ تنہائی میں وہ کیا کرتے ہوں گے؟‘‘

’’ایسی کوئی بات نہ کرو۔ سوچتے سے شرم آتی ہے۔‘‘

چچی نے کہا۔ ’’اس کے ماں باپ کو بھی شرم آنی چاہیے۔ فریدہ بھابی تو روک ٹوک کرتی ہیں مگر جمشید بھائی نے اسے بے لگام چھوڑ دیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے، کیا عشاء کے بعد بھی وہ اس لڑکے سے ملنے جائے گی؟ جائے گی تو بس سمجھ لو، رات کالی کرکے آئے گی۔‘‘

وہ اپنی اپنی فطرت اور مزاج کے مطابق رائے قائم کر رہے تھے۔ انتہائی شرمناک باتیں سوچنے کے باوجود اسے اپنی بہو بنانا چاہتے تھے کیونکہ وہ کروڑوں کی جائداد جہیز میں لانے والی تھی۔

جب عشاء کے وقت وہ واپس آئی تو سب ہی اس پر تنقید کرنا بھول گئے۔ اس پر صدقے واری ہونے لگے۔ فردا نے نماز کے بعد ان کی خوشی کے لیے کیک کاٹا۔ ان کے ساتھ رات کا کھانا کھایا پھر تمام کزنز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’میں بہت تھک گئی ہوں۔ سونے جا رہی ہوں۔ پلیز کوئی مجھے ڈسٹرب نہ کرے۔‘‘

اس نے اپنے بیڈ روم میں آکر دروازے کو اندر سے

بند کرلیا۔ دوپٹے کو اتار کر ایک طرف پھینکا۔ پھر کامران کے نمبر پنچ کرنے لگی، اس کی آواز سنائی دی۔ ”ہائے فردا...!“

وہ مسکرا کے بولی۔ ”ہائے کامران...!“

اس نے کہا۔ ”الفاظ ہوں یا انسان... حالات کے مطابق بدل جاتے ہیں۔ یہ ہائے ماتم کرنے اور سینہ پیٹنے والی نہیں ہے۔ ابھی یہ ہائے ایک خوشبو ہے، جو پیار کرنے والوں کے دلوں سے نکلی ہے۔“

”اُف کامران! تم نے کتنی اچھی اور رومانٹک بات کہی ہے۔“

”عبادت کے وقت صرف عبادت، مشقت کے وقت صرف محنت اور محبت کے وقت صرف محبت ہونی چاہیے۔“

”ہاں۔ زندگی کو صرف ایسی ہی ترتیب سے گزارنا چاہیے۔ آئی لو یو کامران...!“

”آئی لو یو ٹو... تم میری زندگی کو ایک نئے موڑ پر لارہی ہو۔ سوچ رہا ہوں، یہ نیا راستہ ہموار ہوگا یا پیچیدہ؟“

”کوئی پیچیدگی اور رکاوٹ نہیں ہوگی۔ پاپا میری خوشی میں خوش رہتے ہیں۔“

”بعض اوقات ہم جیسا سوچتے ہیں، ویسا نہیں ہوتا۔ خاص طور پر پیار کرنے والوں کے ساتھ تو ویسا کبھی نہیں ہوتا، جیسا سوچا جاتا ہے۔“

”کل پاپا سے ملاقات ہوگی تو تمہارے تمام اندیشے دور ہوجائیں گے۔“

دوسری طرف جمشید کی نیند اڑ گئی تھی۔ اس نے بیٹی کو نماز کی طرف مائل ہوتے دیکھا تو مصلحتاً کامران سے ملاقات کرنے پر بیٹی کو نہیں روکا۔ یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ لڑکا نیک اور دیندار ہے، حیثیت دو کوڑی کی بھی نہیں ہے۔

معلوم ہوا تھا کہ وہ کسی موٹر گیراج میں کام کرتا ہے اور کہیں کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔ یعنی کوٹھی کے ملازموں سے بھی گیا گزرا تھا۔

اگر بیٹی کہتی کہ کامران کو کاروبار کرنے کے لیے دس پندرہ لاکھ روپے دیے جائیں تو وہ دے دیتا لیکن بیٹی نہیں دے سکتا تھا۔

اگر ایک غریب آدمی جان پر کھیل کر امیر آدمی کی جان بچائے تو وہ اسے منہ مانگا انعام دیتا ہے، اسے داماد بنا کر کبھی اونچی سطح پر نہیں لاتا۔

معاشرے میں رائج طبقاتی تقسیم کو اٹل سمجھا جاتا ہے۔ اس میں تبدیلی نہیں آتی۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ کوئی اپنی حیثیت سے اوپر نہ آئے۔ خاندانی برتری کا تقاضا ہوتا ہے کہ کسی کمتر کو اپنے خاندان میں شامل نہ کیا جائے۔

یہ انسانی سوسائٹی کے اصول ہیں۔ جمال جمشید ان اصولوں کے خلاف نچلے طبقے کے ایک جوان کو داماد نہیں بنا سکتا تھا۔ خواہ وہ کتنا ہی دیندار اور عبادت گزار کیوں نہ ہو۔

دوسرے دن کامران فردا کے ساتھ اس کے آفس میں آیا۔ فردا نے باپ سے اس کا تعارف کرایا۔ باپ نے بظاہر مسکرا کے اس سے مصافحہ کیا۔ اسے طنزیہ انداز میں سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بیٹھنے کو کہا۔ وہ فردا کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

اس نے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا کرتے ہو؟“

”ایک موٹر گیراج میں کام کرتا ہوں۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”پھر تو بہت بڑا کام کرتے ہو۔“

”جی ہاں۔ جب آپ کی گاڑیاں چلنے سے انکار کردیتی ہیں تو میں ہی انہیں چلنے اور دوڑنے کے قابل بناتا ہوں۔ انسان وہ ہے جو دوسروں کے لیے آگے بڑھتے رہنے کے راستے ہموار کرتا رہے۔“

”باتیں اچھی کرلیتے ہو۔ تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟ کیا نام ہے ان کا...؟ میں تمہارا خاندانی شجرہ دیکھنا چاہوں گا۔“

اس نے ایک نظر فردا پر ڈالی پھر جمشید کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے والدین کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ میری دادی نانی نے میری پرورش کی ہے۔“

”کیا تمہاری نانی نے یہ نہیں بتایا کہ تمہارے والدین کون تھے؟“

”وہ بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتیں۔“

”اچھا۔ تمہاری تو بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ چلو... یہ بتادو، تم دنیا میں کیسے آئے؟“

کامران نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”میں چاہوں تو ابھی جھوٹ بول سکتا ہوں کہ والدین بچپن میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ میری سگی نانی نے میری پرورش کی۔ پھر میں ایک شاندار فرضی شجرہ بنا کر پیش کروں تو آپ تسلیم کرلیں گے۔“

جمشید نے کہا۔ ”سچ بولو گے تو میں تمہاری عزت کروں گا۔“

”سچ یہ ہے کہ میں اپنے والدین کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ نانی مجھے کہیں سے لائی تھیں۔“

”کہیں کا کیا مطلب؟ کسی کچرا گھر سے یا یتیم خانے سے...؟“

”آپ جو بھی سمجھ لیں۔ وہ مجھے ایسی ہی کسی جگہ سے لائی ہوں گی۔“

فردا اس کی باتیں سن رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”کامران! یہ کیا کہہ رہے ہو؟“

”جو سچ ہے، وہ کہہ رہا ہوں۔ تم نے نماز شروع کی ہے۔ کسی حال میں بھی جھوٹ نہ بولو۔ سچ بولو گی تو تمہاری نمازیں بھی سچی ہوں گی۔ خدا کو راضی رکھو، بندوں کی پروا نہ کرو۔“

وہ باپ سے بولی۔ ”پاپا! آپ نے کہا ہے، کامران سچ بولے گا تو آپ اس کی قدر کریں گے۔“

”بے شک۔ ایسی باتیں سب چھپاتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے ایسے کتنے لوگ ہیں جو جھوٹ بول کر معزز بن کر ہمارے درمیان رہتے ہیں۔ میں مانتا ہوں یہ سچا اور کھرا ہے۔“

وہ خوش ہوکر بولی۔ ”آئی لو یو پاپا...!“

جمشید نے کہا۔ ”میں کاروبار کرنے کے لیے اسے ابھی دس لاکھ روپے دوں گا۔ اس سے بھی زیادہ دوں گا مگر معذرت چاہتا ہوں... اسے رشتے دار نہیں بنا سکتا۔“

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

جمشید نے کہا۔ ”یہاں میرے پاس آکر بیٹھو۔“

”نو پاپا! پہلے آپ اپنے الفاظ واپس لیں۔“

وہ کامران سے بولا۔ ”یہ بہت ضدی ہے۔ تم ہماری خاندانی نیک نامی کو، ہمارے اسٹیٹس کو سمجھو اور اسے سمجھاؤ۔“

اس نے کہا۔ ”اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ فردا کو اپنی محبت سے باز رکھوں تو یہ میرے لیے اُتنا ہی مشکل ہے، جتنا آپ کے لیے ہے۔“

”تم مجھ سے بیس لاکھ روپے لو۔ یہ تمہاری سچائی اور شرافت سے خوش ہوکر دوں گا۔ تم اس کی زندگی سے کہیں دور چلے جاؤ۔“

”میں لاکھوں روپے تو کیا، سارے جہاں کی دولت کے بدلے بھی فردا سے بیوفائی نہیں کروں گا۔“

”میں اسے عاق کردوں گا۔ اپنی دولت اور جائداد سے ایک تنکا بھی نہیں دوں گا۔ یہ خالی ہاتھ تمہارے پاس آئے گی تو اسے کیا کھلاؤ گے کیا پہناؤ گے؟“

”میں آج تک آپ کی دولت کے بغیر زندہ رہا۔ آئندہ آپ کی بیٹی کو بھی زندہ رکھوں گا۔“

فردا نے کہا۔ ”سن لیا آپ نے؟ میرا انتخاب کتنا ٹھوس اور نا قابل شکست ہے؟ آپ کی اطلاع کے لیے کہہ دوں کہ میرے بینک اکاؤنٹ میں تقریباً بیس لاکھ روپے ہیں۔ ہم دونوں کچھ روز پیار محبت سے جی لیں گے۔“

”تم ابھی تک کھڑی ہوئی ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ ابھی بات ختم نہیں ہوئی ہے۔“

وہ پھر کامران کے پاس بیٹھ گئی۔ جمشید نے کہا۔ ”فردا! تم نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ تم جانتی ہو، اپنی اولادوں میں میں تمہیں سب سے زیادہ چاہتا ہوں۔“

”میں جانتی ہوں پاپا...!“

”میں نے تمہیں عاق کرنے کی دھمکی دی تھی۔ اسے دل پر نہ لو۔“

”کوئی بات نہیں پاپا! آپ نے غصے میں کہہ دیا تھا۔“

”میں بری طرح الجھ گیا ہوں۔ تمہاری خاطر مجھے بیوی سے، بہنوں سے، بھائیوں سے اور ان کی جوان اولادوں سے جنگ کرنی ہوگی۔“

پھر اس نے کامران سے کہا۔ ”میرے خاندان میں کچھ سرپھرے لوگ ہیں۔ جب وہ ناکام ہوں گے تو تمہاری زندگی مختصر کردیں گے۔“

”یہ زندگی تو اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ وہ جب چاہے گا، جس طرح چاہے گا... لے لے گا۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔“

فردا نے کہا۔ ”پاپا! میں آپ کی الجھنوں کو سمجھ رہی ہوں۔ کچھ بھی ہو آپ کو میری خاطر یہ جنگ لڑنی ہوگی۔“

”تم میری ایک بات مانو گی تو ضرور تمہارے لیے فائٹ کروں گا۔“

”میں ضرور مانوں گی۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”تم دونوں دو ہفتے تک ایک دوسرے سے نہ ملو۔“

اس نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ”آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟“

”تم کامران سے نہیں ملوگی تو گھر میں ٹینشن پیدا نہیں ہوگی۔ تم میرے ساتھ رہ کر اپنی بات منواؤ گی۔“

کامران نے کہا۔ ”تمہارے پاپا درست کہہ رہے ہیں۔ صرف دو ہفتے کی بات ہے۔ فون کے ذریعے ہماری آدھی ملاقات ہوتی رہے گی۔“

”مگر دو ہفتے تو بہت ہوتے ہیں۔“

”اگر ہم فون پر باتیں نہ کریں۔ ایک دوسرے سے کٹ کر رہ جائیں تو دو ہفتے پہاڑ لگیں گے لیکن ہمارے پاس فون کی سہولت ہے۔ پلیز۔ اپنے پاپا کی بات مان لو۔“

وہ جمشید کے پاس آ کر بیٹھ گئی پھر بولی۔ ’’میں آپ کی بات مان رہی ہوں۔ دو ہفتوں تک گھر سے نہیں نکلوں گی۔ مگر آج مجھے آزادی دیں۔‘‘

باپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ’’ٹھیک ہے۔ جاؤ مگر عشاء سے پہلے گھر آ جانا۔‘‘

’’آل رائٹ پاپا…!‘‘

وہ باپ کے گال کو چوم کر وہاں سے اٹھ گئی اور کامران کے ساتھ آفس سے باہر آ گئی۔ اس نے کہا۔ ’’میں پاپا کی مشکلات کو سمجھ رہی ہوں۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہیں کہ کس طرح میرا ساتھ دیں گے؟‘‘

وہ اس کے ساتھ کار میں آ کر بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔ ’’سچ بولنا اچھا ہے۔ لیکن تم نے اپنی پیدائش کے متعلق سچ بول کر پاپا کو الجھا دیا ہے۔ یہ بات دوسروں کو معلوم ہوگی تو تمام رشتے دار کھل کر اعتراض کریں گے۔ خاندان کے تمام بزرگ پاپا کی ہر بات مانتے ہیں۔ مگر یہ کبھی نہیں مانیں گے کہ ایک لاوارث کو اپنے خاندان میں شامل کیا جائے۔‘‘

کامران نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’بعض اوقات سچ بولنے سے بنتے ہوئے کام بگڑ جاتے ہیں اسی لیے لوگ سچ بولنے سے ڈرتے ہیں۔ ہمارا بھی کام بگڑ سکتا ہے۔ لیکن ہمیں ڈرنا نہیں چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ ہم بچھڑ جائیں گے، کبھی مل نہیں پائیں گے۔‘‘

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ’’میں مر جاؤں گی۔‘‘

’’مرنے والوں کو خدا بھی خودکشی سے نہیں روکتا۔ حوصلے سے جیتی رہو گی تو ہمارے حصے کی خوشیاں ہمیں ضرور ملیں گی۔‘‘

وہ ذرا چپ ہوا پھر بولا۔ ’’اصل بات ہے اللہ پر کامل اعتماد رکھنا۔ اگر وہ بگاڑتا ہے، آزمائش میں مبتلا کرتا ہے تو بھی کامیابی اور کامرانی بھی عطا کرتا ہے۔‘‘

’’یہ دو ہفتے پہاڑ جیسے لگ رہے ہیں۔ میں تم سے جدا ہو کر کیسے وقت گزاروں گی؟‘‘

’’نمازیں پڑھو اور انتظار کرتی رہو اور اپنی نمازوں کو قبولیت کے مقام تک پہنچانے کے لیے سچ بولتی رہو۔ فون کے ذریعے ہماری نصف ملاقاتیں جاری رہیں گی۔ کسی بھی مصیبت کی گھڑی میں ایک کال کرو گی تو میں دوڑا چلا آؤں گا۔‘‘

کامران نے عشاء سے پہلے اپنے گھر کے قریب آ کر کار روک دی۔ فردا نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لیا۔

کار جہاں رکی تھی، وہاں ذرا دور تک تاریکی تھی۔ فردا نے کہا۔ ’’میں تمہاری بات مان کر جدائی برداشت کرنے والی ہوں۔ مجھے اتنا پیار کرو، اتنا پیار کرو کہ میں دو ہفتوں تک اسی سحر میں ڈوبی رہوں۔‘‘

’’ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیے ہیں۔ نکاح سے پہلے یہ بھی مناسب نہیں ہے۔ ابھی تاریکی میں تنہائی میں مجھے اپنے ماں باپ یاد آ رہے ہیں۔ انہوں نے ایسی ہی تنہائی میں دینی احکامات کے خلاف جذباتی غلطی کی ہوگی جس کے نتیجے میری ولادت ہوئی۔ ہمیں دوسروں سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔‘‘

وہ اس کے ہاتھ پر اپنا چہرہ رکھتے ہوئے بولی۔ ’’تم بہت اچھے ہو۔ تم نے اپنے والدین کی مثال دے کر اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ ہمیں ایسی کوئی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ میں تم پر فخر کرتی ہوں۔‘‘

وہ تھوڑی دیر تک پیار بھری باتیں کرتے رہے پھر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ وہ گھر واپس جاتے ہوئے رو رہی تھی۔ اندیشے رلاتے ہیں کہ نہ جانے اب کیا ہونے والا ہے؟ ان لمحات میں جدائی کلیجہ نوچ رہی تھی کہ پھر نہ جانے کب ملاقات ہوگی؟

اس رات عشاء کی نماز کے بعد جمال جمشید نے خاندان کے تمام افراد کو ڈرائنگ روم میں بلایا اور ان سے کہا۔ ’’آج میں نے کامران سے ملاقات کی تھی۔ نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والا وہ نوجوان موٹر گیراج میں کام کرتا ہے۔ اسے میری فردا لائف پارٹنر بنانا چاہتی ہے۔‘‘

اس کے کئی کزنز نے کہا۔ ’’شیم… شیم… شیم…‘‘

بزرگوں نے کہا۔ ’’یہ بڑی شرم کی بات ہے۔ فردا کو اپنے خاندان کی اونچی حیثیت اور نیک نامی کا خیال رکھنا چاہیے۔‘‘

اس کی پھوپھی نے کہا۔ ’’بھائی جان! آپ بیٹی کو سمجھائیں۔‘‘

’’ابھی میں خود کو سمجھا رہا ہوں کہ مجھے بیٹی کی پسند کو پسند کرنا چاہیے یا نہیں…؟‘‘

فریدہ نے کہا۔ ’’یعنی وہ لڑکا آپ کو پسند نہیں ہے اور پسند بھی ہے۔‘‘

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ’’ہاں۔ یہی بات ہے۔‘‘

’’اس میں ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے کہ اسے پسند کیا جائے۔‘‘

’’درست کہتی ہو۔ اس کا کوئی خاندان نہیں ہے۔ کوئی

شجرہ نہیں ہے۔ ماں باپ لاپتا ہیں۔‘‘

پھوپھی نے کہا۔ ’’توبہ توبہ۔ یعنی وہ لاوارث ہے۔ پتا نہیں کیسے پیدا ہوا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟‘‘

رشتے داروں کی بھیڑ میں کہیں سے آواز آئی۔ ’’نہ جانے کس کی اولاد ہے۔‘‘

فردا اچھل کر کھڑی ہو گئی اور غصے سے بولی۔ ’’اگر کسی نے اس کے بارے میں غلط بات کی تو اچھا نہیں ہوگا۔‘‘

باپ نے اس کا بازو تھام کر کہا۔ ’’میں نے تمہیں سمجھایا تھا' کچھ نہیں کہو گی۔ غصہ برداشت کرو گی۔ آرام سے بیٹھو۔ مجھے بات کرنے دو۔‘‘

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ باپ نے پھر سمجھایا۔ ’’بالکل نہیں۔ ایک لفظ بھی نہیں کہو گی۔ چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔‘‘

جمال جمشید نے تمام رشتے داروں پر سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ’’یہ ہمیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ لاوارث ہے؟ اگر وہ سچ نہ بولتا اور ایک خاندانی شجرہ بنا کر لے آتا تو ہم دھوکا کھا جاتے۔ اسے ایک اعلیٰ خاندانی لڑکا تسلیم کر لیتے۔‘‘

وہ سب خاموش رہے۔ جمشید نے کہا۔ ’’یہ سوچنے اور سمجھنے کا مقام ہے کہ ہم جھوٹ پر ایمان لاتے ہیں۔ فریب کھا کر خوش رہتے ہیں۔ میرا ایمان کہتا ہے، ایک سچے نوجوان کی قدر کرنی چاہیے۔‘‘

فریدہ نے پوچھا۔ ’’آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ قدر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اسے اپنی بیٹی دے دیں۔‘‘

وہ بولا۔ ’’ہاں۔ ہم ایک سچے ایماندار کی تمام ضرورتیں پوری کر سکتے ہیں لیکن اسے داماد نہیں بنا سکتے۔‘‘

پھر اس نے بیٹی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ’’کیا کیا جائے؟ میری بیٹی اسے چاہتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے مجھے بھی متاثر کیا ہے۔‘‘

ماموں جان اٹھ کر کچھ کہنا چاہتے تھے۔ جمشید نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ ’’ابھی میں کشمکش میں ہوں۔ اگر وہ واقعی لاوارث ہے تو اسے فردا کے لیے کیسے قبول کروں؟‘‘

اس نے ذرا ٹھہر کر کہا۔ ’’میں نے صحابہ اور اولیا کرام کے اقوال میں کہیں پڑھا ہے کہ کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو نا سمجھ بن کر فیصلے میں جلدی نہ کرو۔ سوچنے سمجھنے کے لیے وقت لو اور علمائے دین کے علم و فضل سے استفادہ کرو۔

میں نے فردا اور کامران سے دو ہفتے کی مہلت لی ہے۔ اس عرصے میں سوچوں گا، سمجھوں گا اور ایک لاوارث کے سلسلے میں علمائے دین سے فتویٰ حاصل کروں گا۔

اگر فتویٰ کامران کے خلاف ہوگا تو فردا میری بات مانے گی اور کامران کو لائف پارٹنر بنانے سے باز رہے گی۔

اگر فتویٰ کامران کے حق میں ہوگا میں کھلے دل سے اسے اپنا داماد بنا لوں گا۔‘‘

فریدہ نے کہا۔ ’’میں تو کبھی اسے داماد تسلیم نہیں کروں گی۔‘‘

’’اگر تم علمائے دین کا فتویٰ تسلیم نہیں کرو گی تو میں تمہیں اپنی زوجہ تسلیم نہیں کروں گا۔ تم میرے نکاح سے خارج ہو جاؤ گی۔‘‘

فریدہ فوراً ہی سر پر آنچل رکھ کر توبہ توبہ کرنے لگی۔ یہ ایسی بات تھی کہ اس کے بعد کوئی کچھ بول نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے وہاں سے اٹھ گئے۔

اس دن کے بعد سب ہی منتظر تھے کہ دیکھیں دین کے حوالے سے کیا فیصلہ سنایا جائے گا؟ وہ تمام رشتے دار بھی اپنے اپنے طور پر علمائے دین سے رجوع کرنے لگے۔ ان سے تحریری فتویٰ حاصل کر رہے تھے۔

کئی علمائے کرام نے متفقہ طور پر کہا تھا کہ کامران اپنے والدین سے کیسے بچھڑ گیا؟ پیدائش کن حالات میں ہوئی؟ اس بات کی صحیح تحقیقات کی جائیں۔

کسی ثبوت کے بغیر اسے ناجائز کہنا مناسب نہیں ہے اور اگر وہ ناجائز ہے تو بے قصور ہے۔ گناہ گار اس کے والدین ہیں۔

جبکہ وہ دیندار ہے۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہے، ہر حال میں سچ بولتا ہے تو وہ قابل قدر ہے۔ ہمیں اسے عزت دینی چاہیے۔

چونکہ وہ سچا اور عبادت گزار تھا اس لیے فتویٰ اس کے حق میں تھا۔ تمام رشتے دار مایوس ہو گئے لیکن جواد اور شمشاد مایوس ہونے والے نہیں تھے۔

انہوں نے اپنے والدین سے کہا۔ ’’آپ فریدہ آنٹی کو راضی کریں کہ وہ فردا کو اسلام آباد اور مری لے جائیں۔ آپ سب بھی ان کے ساتھ جائیں۔ ہم وہاں اپنا کام دکھائیں گے۔‘‘

پھوپھی نے پوچھا۔ ’’کیا ارادے ہیں تمہارے؟ اگر پکڑے گئے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟‘‘

ماموں جان نے کہا۔ ’’بھائی جان کے تعلقات اوپر تک ہیں۔ وہ تمہیں الٹا لٹکا دیں گے۔‘‘

شمشاد نے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ نہ ہمیں کوئی پہچانے گا، نہ ہم پکڑے جائیں گے۔''

جواد نے کہا۔ ''ہم آپ سب کے ساتھ وہاں نہیں جائیں گے۔ آپ سے پہلے ہی مری پہنچ جائیں گے لیکن فریدہ آنٹی اور فردا کی نظروں میں نہیں آئیں گے۔''

شمشاد نے کہا۔ ''ہم نے خوب سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کی ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔''

پھوپھی، ماموں اور چچی نے مل کر فریدہ کو پہاڑی علاقے میں جانے کے لیے راضی کرلیا۔ فریدہ نے بیٹی سے کہا۔ ''تمہیں بھی ہمارے ساتھ چلنا چاہیے۔''

وہ بولی۔ ''مجھے اپنے مجازی خدا سے اجازت ملے گی تو ضرور جاؤں گی۔''

ماں نے جل کر کہا۔ ''نکاح کے بغیر وہ تمہارا مجازی خدا کیسے ہوگیا؟''

''وہ دل کے رشتے سے میرے لیے سب کچھ ہیں۔ میں ابھی ان سے اجازت لیتی ہوں۔''

اس نے فون کے ذریعے رابطہ کیا پھر کہا۔ ''ہائے کامران! آپ کیسے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''میں تو ٹھیک ہوں۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تم مجھے تم کے بجائے آپ کہہ رہی ہو!''

''بات یہ ہے کہ ممی سامنے بیٹھی ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے، میں اپنے ہونے والے مجازی خدا کا احترام کرتی ہوں اور آپ کہہ کر مخاطب کرتی ہوں۔''

فریدہ اسے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی۔ ''ہمارے گھر والے اسلام آباد اور مری کی سیر کے لیے جا رہے ہیں۔ کیا میں ان کے ساتھ جاؤں؟''

''تمہیں ضرور جانا چاہیے۔ تم نے پاپا سے وعدہ کیا ہے کہ دو ہفتے تک گھر سے باہر نہیں نکلو گی۔ لیکن اپنے والدین اور رشتے داروں کے ساتھ باہر کی کھلی فضا میں کچھ روز رہنا چاہیے۔''

''پاپا کاروباری مصروفیات کے باعث نہیں جاسکیں گے۔ میں صرف ایک ہفتے کے لیے جاؤں گی۔ تب تک پاپا کی دو ہفتے والی شرط بھی ختم ہوجائے گی۔ میں سیدھی آپ کے پاس آؤں گی۔''

''اور میں بے چینی سے تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔''

''ذرا حساب کریں، وہ دوسرا ہفتہ کس روز ختم ہوگا؟ میں تھوڑی دیر بعد فون کرتی ہوں۔''

وہ رابطہ ختم کرکے بولی۔ ''ٹھیک ہے ممی! میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔''

وہ منہ بنا کر وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔ ''اُونہہ... میرے کہنے سے نہیں جارہی ہو۔ نہ رشتہ نہ ناتا، نہ جورو نہ شوہر۔ ابھی سے جورو بننے کے چونچلے کررہی ہو۔''

فردا مسکرا کر رہ گئی۔ دوسری صبح وہ سب اپنی اپنی کاروں میں وہاں سے روانہ ہونے والے تھے۔ جمشید نے عشاء کی نماز کے بعد بیٹی سے کہا۔ ''پچھلی رات میں نے خواب میں تمہیں دیکھا ہے... تب سے پریشان ہوں۔''

''ایسا کیا خواب دیکھا تھا؟''

''تم کہیں حبس بے جا میں ہو۔ کمرے کا دروازہ کھولنا چاہتی ہو مگر وہ باہر سے بند ہے۔''

''اگر آپ کا خیال ہے کہ مجھ پر کوئی مصیبت آسکتی ہے تو میں نہیں جاؤں گی۔''

''نہیں بیٹی! تم پچھلے ایک ہفتے سے یہاں کی چار دیواری میں قید ہو۔ تمہیں کھلی فضا میں سانس لینا چاہیے۔ پوری فیملی کے ساتھ خوب انجوائے کرنا چاہیے۔''

وہ جائے نماز سے اٹھ کر الماری کے پاس جاتے ہوئے بولا۔ ''تم ضرور جاؤ لیکن محتاط رہنا۔''

فردا نے دونوں مصلوں کو اٹھا کر تہ کیا۔ پھر انہیں ایک جگہ رکھ کر باپ کے پاس آئی تو چونک گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پستول تھا۔ وہ اسے بیٹی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اسے چھپا کر رکھو۔ کسی کو پتا نہ چلے۔ خدا نہ کرے کوئی ایسی ویسی بات ہو۔ مگر اسے کسی بھی برے وقت کے لیے اپنے پاس سنبھال کر رکھو۔''

اس نے کمرے میں آکر پستول کو اپنے اٹیچی میں رکھا پھر دوسری صبح جانے سے پہلے اسے لباس کے اندر چھپالیا۔

وہاں سے چھ کاروں میں وہ قافلہ روانہ ہوا۔ انہوں نے اسلام آباد پہنچ کر ایک دن اور ایک رات گزاری۔ پھر دوسرے دن مری پہنچ گئے۔

کامران سے فون پر برابر رابطہ مسلسل تھا۔ وہ بتاتی کہ کس طرح فیملی کے ساتھ انجوائے کررہی ہے اور نمازیں باقاعدگی سے ادا کررہی ہے۔

وہ تیسرے دن ایوبیہ کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہ چھ گاڑیاں کبھی ایک دوسرے سے بہت دور ہوجاتیں، کبھی ایک دوسرے کے قریب ہوجاتی تھیں۔ پہاڑی راستے پُرپیچ اور خطرناک موڑ والے ہوتے ہیں۔ فردا ایسے راستوں پر ڈرائیونگ سے گریز کرتی تھی۔ ایک ڈرائیور اس کی کار چلا رہا تھا۔

اس کار میں فردا، اس کی ممی اور چچی بیٹھی ہوئی تھیں۔ اگلی سیٹ پر چچی کا ایک کمسن بیٹا تھا۔ ان کی کار پیچھے رہ گئی اور باقی گاڑیاں آگے نکل گئیں۔

ایسے ہی وقت ان کی کار اچانک رک گئی۔ سامنے سڑک پر ایک شخص منہ پر ڈھاٹا باندھے کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک ریوالور تھا۔ ان کی کار اس ریوالور کے نشانے پر تھی۔ وہ نہ رکتی تو وہ فائرنگ شروع کر دیتا۔

فردا آنکھیں بند کیے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے کامران کے تصور میں کھوئی ہوئی تھی۔

جب اس اجنبی نے بالکل قریب آکر پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خواتین کو دھمکی دی تو اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ دیر ہو چکی تھی۔ اب وہ اپنا پستول نہیں نکال سکتی تھی۔ ایسی کوئی حرکت کرنے سے پہلے ہی وہ ان سب کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیتا۔

اس نے فردا کو حکم دیا۔ ”باہر آؤ۔ جلدی کرو۔ کوئی الٹی سیدھی حرکت کرو گی تو کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

وہ اپنا پرس لے کر چپ چاپ باہر آگئی۔ اس نے پرس چھین کر اس کی ممی اور چچی سے موبائل فون طلب کیے۔ ڈرائیور کے پاس بھی فون تھا، اسے بھی لے کر رکھ لیا۔ پھر ان سے کہا۔ ”یہاں سے جاؤ اور اس لڑکی کو بھول جاؤ۔“

فریدہ نے تڑپ کر کہا۔ ”میری بچی کو کیوں روک رہے ہو؟ تمہیں جتنی رقم کی ضرورت ہے، مجھ سے لے لو۔ میری بیٹی پر کوئی ظلم نہ کرو۔“

وہ ڈانٹ کر بولا۔ ”میرا وقت برباد نہ کرو۔ فوراً یہاں سے جاؤ۔ ورنہ تم سب ماری جاؤ گی۔“

فردا پریشان تھی۔ اتنا موقع مل رہا تھا کہ وہ لباس کے اندر سے پستول نکال کر اس پر فائر کر سکتی لیکن ایسے وقت اس کے ریوالور سے بھی فائرنگ ہوتی تو اس کی ممی یا چچی زد میں آسکتی تھیں۔

وہ صبر کر رہی تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ اس کے پاس اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار موجود ہے۔ ڈرائیور نے اس کی دھمکی سے مجبور ہو کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ اسے اپنی ممی کے رونے اور واویلا کرنے کی آوازیں کچھ دور تک سنائی دیں پھر وہ کار آگے جا کر ایک موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

وہ اس اجنبی کے ساتھ سڑک کے کنارے تنہا بے یار و مددگار رہ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟ اگر تاوان کی بھاری رقم حاصل کرنا چاہتے ہو تو میں ایک گھنٹے کے اندر ادا کر سکتی ہوں۔“

اب اس شخص کے منہ پر ڈھاٹا بندھا ہوا نہیں تھا۔ وہ سڑک کے کنارے ایک جوان لڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہاں سے گزرنے والی گاڑیوں سے لوگ ان پر ایک نظر ڈالتے ہوں گے۔ اس لیے وہ فردا سے تقریباً لگ کر کھڑا ہوا تھا۔ کوٹ کی جیب میں رکھے ہوئے ریوالور کی نال اسے چبھ رہی تھی۔ فردا نے پھر بڑی رقم کی پیشکش کی۔

وہ بولا۔ ”خاموش رہو۔ جب بھی یہاں سے کوئی گاڑی گزرے تو مجھ سے مسکرا کر کچھ بھی بات کر لینا۔“

اس نے پوچھا۔ ”ہم یہاں کیوں کھڑے ہیں؟“

اسی وقت ایک گاڑی ان کے قریب آکر رک گئی۔ اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”بیٹھو...“

وہ اس کے قریب سے گزرتی ہوئی اندر آکر بیٹھ گئی۔ وہ بھی اسی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی گاڑی آگے بڑھ گئی۔ وہ مسلسل نشانے پر تھی۔ اس کی جگہ کوئی ماہر چالباز جنگجو ہوتا تو چشم زدن میں لباس کے اندر سے پستول نکال کر مقابلے پر ڈٹ جاتا۔

لیکن وہ ایسے حالات سے پہلی بار گزر رہی تھی۔ اس اجنبی سے مقابلہ کرنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ عقل سمجھا رہی تھی کہ صبر کرنا چاہیے۔ کسی مناسب موقع پر اپنی پستول کو کام میں لانا چاہیے۔

وہ گاڑی نہ ایوبیہ کی سمت جا رہی تھی نہ مری کی طرف۔ وہ کسی تیسرے راستے پر مڑ گئی۔ معلوم نہیں کتنا لمبا سفر تھا؟ فردا نے ایک گھنٹے بعد پوچھا۔ ”آخر مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

وہ ڈانٹ کر بولا۔ ”آرام سے بیٹھی رہو۔ ہم تمہیں گھر نہیں لے جا رہے۔ جہاں بھی لے جا رہے ہیں، وہاں جانا... پڑے گا۔“

گاڑی ڈرائیو کرنے والے نے کہا۔ ”ویسے یہ بزدل نہیں ہے۔ بڑی جیدار ہے۔ کوئی اور ہوتی تو رونے لگتی۔“

مزید آدھے گھنٹے بعد گاڑی سڑک کے کنارے رک گئی۔ فردا بدستور نشانے پر رہ کر گاڑی سے باہر آئی۔ پھر ڈرائیور کے پیچھے چلتی ہوئی دور تک ایک ڈھلان پر اترنے لگی۔ ریوالور والا اس کے پیچھے تھا۔ گھنے درختوں کی بہتات کے باعث سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کتنی پگڈنڈیوں سے مڑتے ہوئے کس سمت جا رہے ہیں؟ پہاڑی راستے بھول بھلیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ ان راستوں میں الجھ گئی تھی۔ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی کہ وہاں سے واپس کیسے جائے گی؟

تقریباً ایک گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد وہ ایک

بڑے سے کاٹیج میں پہنچ گئے۔ انہوں نے کہا۔ ”یہاں تم آرام سے رہو۔ جب دن ڈھل جائے گا، تب تمہارے دوست آئیں گے۔ تم انہیں خوش کرو گی۔ وہ تمہیں خوش کریں گے۔“

انہوں نے اسے ایک کمرے میں دھکا دے کر دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ وہاں تنہا ہوتے ہی اس نے لباس کے اندر سے اپنا پستول نکالا۔ چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ اس کمرے میں ایک کھڑکی بھی نہیں تھی۔

اس نے دروازے کو پیٹتے ہوئے کہا۔ ”پلیز دروازہ کھولو۔ میری ایک بات سن لو پھر مجھے یہیں بند کر دینا۔“

وہ چاہتی تھی، ایک بار وہ دروازہ کھول کر اسے نہتا سمجھ کر آئیں اور اس کا نشانہ بن جائیں۔ پھر وہ وہاں سے فرار ہو جائے گی۔

اس نے پھر آواز دی۔ ”میں بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔ پلیز۔ میرے پاس آؤ۔“

اسے کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے پریشان ہو کر ادھر اُدھر دیکھا۔ ایک دیوار میں چھوٹا سا روشن دان بنا ہوا تھا۔ وہاں ایک صندوق رکھا ہوا تھا۔ وہ صندوق پر کرسی رکھ کر روشن دان تک پہنچ گئی۔

وہاں سے جنگل کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ بہت دور چڑھائی پر وہ دونوں واپس جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ پستول کی رینج سے بہت دور تھے۔ اس کی چلائی ہوئی گولیاں ضائع ہو جاتیں۔

وہ جھنجلا کر فائر کرنا چاہتی تھی۔ انہیں بتا دینا چاہتی تھی کہ وہ نہتی نہیں ہے۔ پھر عقل آئی کہ رات کو کچھ لوگ آنے والے ہیں۔ فی الحال انہیں یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ نہتی اور کمزور ہے۔ ایسے ہی وقت اس کا پستول کام آسکے گا۔

وہ روشن دان سے نیچے اتر آئی۔ پورا کاٹیج لکڑیوں سے بنا ہوا تھا۔ لکڑیاں پرانی اور بوسیدہ ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا، صدیوں پرانا کاٹیج ہے۔ اس نے دروازے کے پاس آکر اسے ہلایا تو ہلکی سی کھڑکھڑ کی آواز سنائی دی۔ باہر سے لوہے کی زنجیر اوپر کنڈی سے لگائی گئی تھی۔ اس نے زور زور سے دروازے کو ہلایا تو وہ بھی زوردار آواز سے بجنے لگی۔ دروازے کے ساتھ چوکھٹ بھی لرزنے لگی۔

وہ پیچھے ہٹ کر دروازے اور چوکھٹ کو بغور دیکھنے لگی۔ اس کی جگہ کوئی مرد ہوتا تو دو چار ٹکروں میں دروازے کو توڑ ڈالتا۔ اس نے سوچا۔ ”اگر میں مسلسل زور لگاؤں تو شاید دروازہ ٹوٹ جائے یا اوپر لگی ہوئی زنجیر نیچے آجائے۔ جب تک دم میں دم ہے میں کوشش کرتی رہوں گی۔“

دروازے کو اندر سے بند کرنے کے لیے لکڑی کا گٹکا لگا ہوا تھا۔ وہ اسے پکڑ کر پوری قوت سے ہلانے لگی۔ باہر لوہے کی زنجیر لرز رہی تھی۔ یقین دلا رہی تھی کہ اپنی جگہ چھوڑ سکتی ہے۔

خدا ہمت کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے... وہ تھک کر ہانپنے لگی لیکن ہمت نہیں ہاری۔ سانس معمول پر آتے ہی پھر دروازے کو جھٹکے دینے لگی۔ ایسا اس نے وقفے وقفے سے تین بار کیا۔ چوتھی بار زنجیر اوپر سے نیچے آگئی اور دروازہ کھل گیا۔

اس نے خوش ہو کر ایک گہری سانس لی۔ اپنی مضبوط قوتِ ارادی اور محنت سے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس نے باہر آکر دیکھا۔ انہوں نے زنجیر کو کنڈی سے لگا کر ایک مضبوط تالا لگایا تھا۔ وہ چابی کے بغیر کھلنے والا نہیں تھا لیکن وہ کنڈی ہی جڑ سے اکھڑ کر نیچے آگئی تھی۔ بوسیدہ چوکھٹ پر کنڈی کی جگہ دو سوراخ دکھائی دے رہے تھے۔ تالا زنجیر اور کنڈی کے ساتھ لٹک رہا تھا۔

اس نے پستول کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ جس سمت سے آئی تھی ادھر دور تک دیکھنے لگی۔ شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی، رات کی تاریکی میں کہاں جائے گی؟

اس نے آتے وقت دیکھا تھا، وہ دشمن اسے بڑے ہی پیچیدہ راستوں سے لے کر آئے تھے۔ اس جنگل میں کئی پگڈنڈیاں مختلف سمتوں میں گئی تھیں۔ وہ کس پگڈنڈی پر چل کر کس آبادی تک پہنچے گی؟

وہ بھٹکتی ہوئی ان دشمنوں سے بھی ٹکرا سکتی تھی، جو ادھر آنے والے تھے۔ سب سے اہم بات یہ کہ ٹارچ لائٹ یا لالٹین کی روشنی کے بغیر وہاں سے جا نہیں سکتی تھی۔

اس کاٹیج میں مزید دو کمرے تھے۔ وہاں کھانے پینے کا سامان اور شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں اور آنے والوں کی نیتوں کا حال بتا رہی تھیں۔

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی، عیاش دشمنوں سے کس طرح چھپے گی؟ نہ اس کاٹیج سے دور جا سکتی تھی، نہ وہاں چھپنے کی کوئی جگہ تھی۔

اس نے چھت کی طرف دیکھا۔ پھر کاٹیج کے دائیں طرف گئی۔ وہاں ایک سیڑھی چھت پر جانے کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ فی الحال وہ اوپر جا کر ان سے کچھ فاصلہ رکھ سکتی تھی۔ وہ کسی وقت بھی وہاں پہنچ سکتے تھے۔ وہ فوراً ہی چھت پر آگئی۔ لکڑی کی بوسیدہ سیڑھی کو بھی کھینچ کر اوپر لے آئی۔

تاکہ دشمن آسانی سے چھت پر نہ چڑھ سکیں۔

وقت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے دشمنوں کے شکنجے میں رہنے کے باعث عصر اور مغرب کی نماز نہ پڑھ سکی۔ رات کی تاریکی میں اندازہ نہیں کرسکتی تھی کہ قبلہ کس سمت ہے؟

اس نے اندازے سے ایک سمت رخ کر کے عشاء کی نماز ادا کی پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ ''اے ربِ کریم! مجھ پر کرم فرما۔ میں تنہا، بے یارومددگار ہوں۔ مجھے میرے کامران اور پاپا سے ملادے۔

مجھے حوصلہ دے کہ میں دشمنوں سے محفوظ رہنے کی ہمت کرسکوں۔ دشمنوں کو ان کے ناپاک ارادوں میں ناکام کردے میرے مالک! مجھے عزت وآبرو سے میرے گھر پہنچا دے... آمین!''

نماز کے دوران میں چاند نکل آیا تھا۔ کسی حد تک تاریکی چھٹ گئی تھی۔ وہ نماز کے بعد پچھلی یاد کی ہوئی سورتوں کو دہرا رہی تھی۔ ایسے ہی وقت دور درختوں کے درمیان ٹارچ کی روشنی دکھائی دی۔

وہ آرہے تھے۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ نہ جانے آنے والے لمحات میں کیا ہونے والا تھا؟

وہ چھت پر اوندھے منہ لیٹ کر ادھر دیکھنے لگی۔ اس نے پستول مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

وہ لوگ چڑھائی پر تھے۔ ٹارچ کی روشنی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ڈھلان سے اترتے ہوئے کاٹیج کی طرف آرہے ہیں۔ سامنے کھلی جگہ پر آتے ہی چاند کی روشنی میں تین افراد سائے کے مانند دکھائی دیے۔

پہلے تو وہ واضح نہیں تھے۔ کاٹیج کے قریب آئے تو فردا نے انہیں پہچان لیا۔ وہ جواد اور شمشاد تھے۔ ان کے ساتھ وہی ریوالور والا آدمی تھا جو اسے کمرے میں بند کر کے گیا تھا۔

وہ اپنے کم ظرف کزنز کو دیکھ کر غصے سے تلملا گئی۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس قدر گر جائیں گے۔ اس کی عزت سے کھیلنے کے لیے اسے اغوا کرائیں گے اور بے دست و پا کردینے کے لیے ایک تاریک جنگل میں پہنچادیں گے۔

انہوں نے کاٹیج کے بالکل قریب آکر ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو چونک گئے۔ ایک نے حیرانی سے کہا۔ ''ارے! یہ دروازہ تو کھلا ہوا ہے؟''

وہ تینوں دوڑتے ہوئے اس کمرے کی طرف گئے۔ فردا کی نظروں سے اوجھل ہوگئے لیکن ان کی آوازیں واضح طور پر سنائی دے رہی تھیں۔

وہ تینوں اسے کاٹیج کے تمام کمروں میں ڈھونڈ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔ ''وہ نازک سی لڑکی ہے۔ کنڈی توڑ نہیں سکتی۔ یہاں ضرور کوئی اس کی مدد کے لیے آیا ہوگا۔''

شمشاد کی آواز سنائی دی۔ ''یہاں کون آیا ہوگا؟ ادھر سے تو شاید ہی کوئی گزرتا ہوگا۔ یہ دیکھو... یہ چوکھٹ کمزور ہے۔ بار بار دھکا دینے کی وجہ سے کنڈی اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے۔''

جواد کی آواز سنائی دی۔ ''وہ بہت ضدی اور طوفانی مزاج والی لڑکی ہے۔ اس نے جنون میں آکر اس مقفل دروازے کو کھولا ہے۔ اسے ڈھونڈو، وہ یہاں سے فرار ہونے کے بعد بھی راستہ نہیں پائے گی۔ جنگل میں بھٹکتی رہے گی۔''

وہ سب کاٹیج سے باہر کھلی فضا میں آگئے۔ دور دور تک ٹارچ کی روشنی ڈال کر دیکھنے لگے۔ وہ تینوں صاف طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے صرف اسی شخص کے پاس ریوالور تھا جو اسے کمرے میں بند کر کے گیا تھا۔

کاٹیج کے پچھلے حصے میں گہری کھائی تھی۔ انہوں نے کاٹیج کے دائیں بائیں جا کر دیکھا۔ جواد نے کہا۔ ''جب ہم پچھلی گرمیوں میں آئے تھے تو یہاں ایک سیڑھی تھی۔ وہ کہاں ہے؟''

ریوالور والے نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا۔ میں تو اسے بند کرنے کے بعد یہاں سے چلا گیا تھا۔ شمشاد نے چھت کی طرف ٹارچ روشن کی۔ فردا اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ اس نے سر جھکا لیا تھا۔ وہ نیچے سے نظر نہیں آسکتی تھی۔

ایک نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے، کوئی لکڑیاں جلانے کے لیے سیڑھی یہاں سے لے گیا ہو یا وہ چھت پر پڑی ہو۔''

اس نے پھر چھت کی طرف روشنی کی۔ ریوالور والے نے کہا۔ ''چھت بہت اونچی ہے۔ لڑکی سیڑھی کے بغیر اوپر جا نہیں سکتی۔ وہ دروازہ کھلتے ہی دن کی روشنی میں یہاں سے فرار ہوگئی ہے۔''

جواد نے شمشاد سے کہا۔ ''اگر وہ ہاتھ سے نکل گئی تو سمجھ لو! دوبارہ ہاتھ نہیں آئے گی۔ اس کی مغرور جوانی سے کھیلنے کی حسرت ہی رہ جائے گی۔''

فردا ان کی باتیں سن رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ ''لگتا ہے، یہ تینوں رات کو واپس نہیں جائیں گے۔ کاٹیج میں صبح تک رہیں گے۔ میں چھت پر کب تک ساکت پڑی رہوں

گی؟ کروٹ بدلوں گی، یا اٹھنے بیٹھنے کی غلطی کروں گی تو لکڑیوں کی چرچراہٹ نیچے سنائی دے گی۔ پھر وہ چھت پر آنے میں دیر نہیں کریں گے۔''

دانشمندی یہی تھی کہ وہ اسی وقت ان سے نمٹ لے۔ وہ تینوں کاٹیج کے سامنے کھلی جگہ پر تھے۔ چاندنی میں ریوالور والا صاف طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ فردا نے اللہ کا نام لے کر نشانہ لیا پھر گولی چلادی۔

جنگل کے سناٹے میں دور تک فائر کی آواز گونجتی چلی گئی۔ نشانہ ذرا چوک گیا اور گولی سینے کے بجائے شانے پر لگی۔

وہ اچھل کر زمین پر گرا۔ ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف چلا گیا۔ وہ دونوں چونک گئے۔ جواد فوراً کاٹیج کے اندر گیا۔ شمشاد نے ریوالور کی طرف چھلانگ لگائی۔ فائر کی دوسری آواز موت کی طرح گونجی۔ شمشاد کے حلق سے چیخ بھی نہ نکل سکی۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی۔

جواد نے دہشت زدہ ہو کر کاٹیج میں چھپ کر دیکھا۔ شمشاد ریوالور کے پاس زمین پر تڑپ رہا تھا۔ پھر دیکھتے دیکھتے ٹھنڈا پڑ گیا اور ہمیشہ کے لیے ساکت ہوگیا۔

اسے اغوا کرنے والے کے شانے پر گولی لگی تھی۔ وہ زندہ تھا۔ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ ریوالور اس سے دو گز کے فاصلے پر تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ رینگتا ہوا اسے اٹھا لیتا۔ وہ شمشاد کا انجام دیکھ چکا تھا۔

جواد برآمدے میں تھا۔ فی الحال مطمئن تھا کہ چھت سے ہونے والی فائرنگ سے محفوظ رہے گا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ایک طرف ریوالور تھا اور دوسری طرف ٹارچ پڑی ہوئی تھی۔ دونوں چیزیں اس کے لیے ضروری تھیں اور وہ وہاں سے ایک چیز بھی اٹھا کر لانے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

وہ زخمی شخص وہاں سے فرار ہونے کے لیے زمین پر گھسٹتا ہوا شوٹنگ رینج سے دور ہونے کے بعد اٹھ کر بھاگنا چاہتا تھا۔ فردا نے اس کا نشانہ لیا پھر گولی چلادی۔ وہ جہاں تھا، وہیں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ گولی اس کی پشت میں پیوست ہو کر دل میں سوراخ کرتی ہوئی سینے سے نکل گئی تھی۔

جواد کے ہوش اڑ رہے تھے، وہ تنہا رہ گیا تھا۔ اس کے پاس ہتھیار نہیں تھا۔ وہ تو فردا کو کمزور اور بے بس سمجھ کر عیاشی کرنے آیا تھا۔

اس نے اور شمشاد نے سوچا تھا' اس ویرانے میں خوب مزے اڑائیں گے پھر اسے کرائے کے قاتل کے حوالے کر کے چلے جائیں گے۔ اب وہ کرائے کا قاتل اس کے سامنے مردہ پڑا تھا اور شمشاد بھی جہنم میں پہنچ چکا تھا۔

اسے اپنا انجام صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے چھت کی طرف منہ کر کے کہا۔ ''فردا! مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ تم گولیاں چلا رہی ہو۔ تمہارے پاس اسلحہ کہاں سے آیا؟''

وہ بولی۔ ''آم کھانے والے پیڑ نہیں گنتے۔ تم بھی گولی کھاؤ، اسلحہ کا حساب نہ کرو۔''

پھر وہ تیز لہجے میں بولی۔ ''باہر نکل کُتّے! کمینے! ابھی تو نے درست کہا تھا کہ میری مغرور جوانی سے کھیلنے کی حسرت رہ جائے گی۔ تو بھی یہاں سے زندہ نہیں جاسکے گا۔''

وہ دیوار سے لگ کر دبے قدموں چلتا ہوا کاٹیج کے ایک طرف آیا۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ فردا کی نظریں سامنے کی طرف ہیں، وہ زمین پر پڑے ہوئے ریوالور کو اٹھانے کا موقع نہیں دے گی۔ اس لیے وہ دوسری سمت آکر زمین پر گھٹنے ٹیک کر رینگتا ہوا وہاں سے دور جانے لگا۔

فردا اس کی چالاکی کو سمجھ نہیں سکتی تھی۔ اس سے بے خبر رہتی اور ساری رات انتظار کرتی رہتی کہ وہ ریوالور اٹھانے کسی بھی وقت کاٹیج سے باہر آئے گا۔ یوں ساری رات دھوکے میں رہتی...

لیکن تقدیر اس پر مہربان تھی۔ وہ چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتا جا رہا تھا۔ اسی وقت ایک گلہری اس کے نیچے سے چیختی ہوئی گزری تو اس کے حلق سے بھی چیخ نکل گئی۔ اس کے خوفزدہ ذہن میں یہ بات آئی کہ کسی جنگلی بلا نے حملہ کردیا ہے۔

فردا نے فوراً ہی اٹھ کر چھت پر دوڑتے ہوئے آواز کی سمت دیکھا۔ جواد سنبھلا اور اٹھ کر وہاں سے بھاگنے لگا۔ فردا نے گولی چلائی، وہ گولی موت کی آواز تھی۔ گولی نہ لگنے کے باوجود وہ لڑکھڑا کر گرا مگر فوراً ہی اٹھ کر بھاگنے لگا۔

وہ شوٹنگ رینج سے باہر جاچکا تھا۔ فردا اسے دیکھتی رہی۔ وہ چاندنی میں دور تک سائے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ پھر درختوں کے جھنڈ میں نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

وہ اتنی دور جاچکا تھا کہ واپس آکر حملہ کرنے میں دیر لگتی۔ پھر وہ نہتا تھا، پلٹ کر آنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے فوراً ہی سیڑھی کو کھینچ کر نیچے پہنچایا۔ چھت سے اترتے ہی دوڑتی ہوئی آکر ریوالور کو اٹھا لیا۔ اپنے پستول کو لباس کے اندر رکھا۔ شمشاد کی جیب سے موبائل فون نکال کر چیک کیا۔ بیٹری فل نہیں تھی۔ اس وقت فون اس کے لیے بہت

اہم تھا۔ اس نے کرائے کے قاتل کی جیب سے بھی فون نکال لیا۔

وہ بہت محتاط تھی۔ دور تک دیکھتی بھی جارہی تھی۔ پھر ٹارچ اٹھا کر کاٹیج کے اندر آئی۔ وہاں سے بستر اور کمبل کو اٹھا کر سیڑھی کے پاس آگئی۔ اس نے تھوڑی دیر میں تمام ضروری سامان چھت پر پہنچا دیا۔ پھر سیڑھی کو اوپر کھینچ لیا۔ بڑی حد تک اطمینان ہوا کہ کوئی آسانی سے وہاں تک پہنچ نہیں پائے گا۔

ایک تنہا سپاہی حوصلے سے پورا میدان مار لیتا ہے۔ وہ پورے حوصلے کے ساتھ بدترین حالات سے لڑ رہی تھی اور کامیاب تھی۔ وہ بستر بچھا کر کمبل لپیٹ کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے فون کے ذریعے پہلے اپنے باپ سے رابطہ کیا۔ ”ہیلو پاپا! میں فردا بول رہی ہوں۔“

جمال جمشید اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ ”میری بیٹی! میری جان! تم کہاں ہو؟ ہم سب تمہارے لیے پریشان ہیں۔ ہوم منسٹر نے حکم دیا ہے کہ تمہیں مری اور ایوبیہ کے درمیان تلاش کیا جائے۔ فورسٹ ڈیپارٹمنٹ کے سپاہی تمہیں تلاش کررہے ہیں۔ تم گائیڈ کرو، ابھی کہاں ہو؟“

”میں صحیح جگہ کی نشاندہی نہیں کرسکتی۔ ایوبیہ سے مری کی سمت جاتے ہوئے ایک تیسرا راستہ ہے۔ اس راستے پر آدھے گھنٹے تک گاڑی چلتی رہی تھی۔ پھر ایک جگہ رک گئی تھی۔“

وہ چاندنی میں دور تک دیکھتی جارہی تھی اور کہتی جارہی تھی۔ ”مجھے اغوا کرنے والے وہاں سے پیدل ایک گھنے جنگل میں لے کر آئے تھے۔ جنگل میں اتنی پیچیدہ پگڈنڈیاں تھیں کہ یاد نہیں رہا، کن پگڈنڈیوں سے گزرتی ہوئی یہاں کاٹیج میں آئی ہوں۔“

پھر اس نے پوچھا۔ ”کیا تمام رشتے دار آپ کے آس پاس ہیں؟“

”ہاں۔ میں تمہیں تلاش کرنے کے لیے مری آگیا ہوں۔ یہاں سب ہی موجود ہیں۔“

”تو پھر انہیں یہ خوشخبری سنائیں کہ مجھے جواد اور شمشاد نے اغوا کرایا ہے۔“

جمشید نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“

”اگر آپ کو یقین نہیں ہے تو فون بند کردیں۔“

”نہیں میری جان! مجھے یقین ہے۔ میں ان دونوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

پھر جمال نے اپنی بہن اور سالے کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تھو ہے تم لوگوں پر... تمہارے بیٹوں نے میری بیٹی کو اغوا کرایا ہے۔“

پھر اس نے فون پر پوچھا۔ ”وہ دونوں کہاں ہیں؟“

”پاپا! آپ کا دیا ہوا پستول بہت کام آیا ہے۔ وہ دونوں میری عزت لوٹنے آئے تھے۔ میں نے شمشاد کو اور ان کے کرائے کے قاتل کو گولی مار دی ہے۔ ان کی لاشیں کاٹیج کے باہر پڑی ہیں۔ جواد جان بچا کر فرار ہوگیا ہے۔“

جمشید نے اپنے سالے سے کہا۔ ”مجھے اپنی بیٹی کی دلیری پر ناز ہے۔ اس نے تمہارے بیٹے کو گولی مار کر جہنم میں پہنچا دیا ہے۔ چلو تم بھی اٹھو، میری نظروں سے دور ہوجاؤ۔ لاہور جاکر میرے گھر میں قدم نہ رکھنا ورنہ میرے ملازم تمہیں جوتے مار کر وہاں سے نکالیں گے۔“

پھر وہ بہن سے بولا۔ ”تمہارا بیٹا جان بچا کر بھاگ گیا ہے۔ لیکن بھاگ کر کہاں جائے گا؟ تمہیں بھی اس کی لاش جلد ہی ملے گی۔“

بہن دونوں ہاتھ جوڑ کر بیٹے کے لیے رحم کی بھیک مانگنے لگی۔ جمشید نے اس کے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔ ”اس کتے نے میری بیٹی کی عزت سے کھیلنے کے لیے اسے اغوا کرایا۔ نہ جانے وہ جنگل کے کس کاٹیج میں ہے؟ تنہا اور بے یارو مددگار ہے اور تم سمجھتی ہو، میں تمہارے بیٹے کو معاف کردوں گا؟“

اس نے ملازموں کو حکم دیا کہ بہن۔ اور سالے کو وہاں سے دھکے دے کر نکال دیں۔

پھر بیٹی سے کہا۔ ”میں تمہاری روداد بعد میں سنوں گا۔ ابھی ہوم منسٹر سے رابطہ کرتا ہوں۔ انشاء اللہ ہیلی کاپٹر کے ذریعے تمہیں تلاش کرلیں گے۔“

وہ بولی۔ ”میں دشمنوں سے بچنے کے لیے کاٹیج کی چھت پر ہوں۔ جب ہیلی کاپٹر آئے گا، میں ٹارچ کے ذریعے سگنل دوں گی۔“

”پاپا کی جان! تم سلامت رہو ہزار برس۔ میں صبح ہونے سے پہلے تمہیں وہاں سے لے آؤں گا۔“

باپ سے رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ فون دیکھ کر سوچنے لگی کہ اب کامران سے بات کرنی چاہیے لیکن اس سے کیا کہے گی؟ جب یہ معلوم ہوگا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے تو وہ تڑپ جائے گا اور جب پتا چلے گا کہ وہ ایک گھنے جنگل میں بالکل تنہا ہے تو وہ پاگلوں کی طرح مری کی طرف دوڑا چلا آئے گا۔ دانشمندی یہ تھی کہ اسے پریشان نہ کیا جائے۔ صرف ایک رات کی بات ہے۔ کسی وقت بھی گھر پہنچتے ہی اس سے رابطہ کروں گی۔

اس نے صبر کیا۔ کمبل میں اچھی طرح چھپ کر بیٹھ گئی۔ رات جیسے جیسے گزر رہی تھی، سردی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ زیر لب آیتیں پڑھنے لگی۔ بار بار دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ اندیشہ تھا کہ دشمن پلٹ کر آسکتا ہے۔ اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ اس نے رات کے ایک بجے ہیلی کاپٹر کی آواز سنی۔ وہ ہاتھ میں ٹارچ لے کر کھڑی ہوگئی۔ دور ایک ہیلی کاپٹر کی ننھی سی لائٹ جلتی بجھتی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ اپنی ٹارچ کی روشنی آن آف کرنے لگی۔ دور چکر کاٹتے ہیلی کاپٹر کو سگنل ملا تو وہ کاٹیج کی طرف آنے لگا۔ قریب آتے ہی تیز ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ آس پاس کے درختوں کے پتے شور مچانے لگے۔ وہ کاٹیج کے سامنے کھلے میدان میں اتر رہا تھا۔

فردا نے سیڑھی کو نیچے زمین تک پہنچایا۔ پھر ریوالور، فون اور ٹارچ لے کر نیچے آگئی۔ ہیلی کاپٹر کی پنکھڑیاں بند ہوگئی تھیں۔ ایک پولیس افسر اور دو مسلح سپاہی باہر آگئے۔ افسر نے فردا کو سر سے پاؤں تک حیرانی سے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ”تم نے تنہا ان دونوں کو ہلاک کیا ہے؟“

اس نے ریوالور افسر کو دیتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔ یہ جو لاش پڑی ہے، یہی وہ کرائے کا قاتل تھا۔ یہ ریوالور اسی کا ہے۔“

وہ اپنے لباس کے اندر سے پستول نکال کر دکھاتے ہوئے بولی۔ ”میں نے اس پستول سے انہیں ہلاک کیا ہے۔“

افسر نے اس پستول کو بھی اپنے پاس رکھ لیا۔ سپاہیوں سے کہا کہ دونوں لاشوں کو ہیلی کاپٹر کے پچھلے حصے میں ڈال دیں۔ پھر اس نے کاٹیج کے اندر جاکر شراب کی بوتلیں دیکھیں۔ فردا سے دو چار سوالات کیے۔ پھر کہا۔ ”آؤ اسلام آباد چلو۔ وہاں تمہارے پاپا انتظار کررہے ہیں۔“

وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے ان کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگئی۔ تقریباً دو بجے اسلام آباد پہنچی۔ جمال جمشید ہیلی پیڈ پر موجود تھا۔ اس نے بیٹی کو گلے سے لگا لیا۔ وہ دوسری صبح لاہور جانا چاہتے تھے۔

انٹیلی جنس کے ایک افسر نے کہا۔ ”آپ کی صاحبزادی نے دو قتل کیے ہیں۔ اس کیس کو مضبوط بنانا ہوگا کہ اسے جبراً اغوا کیا گیا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنی آبرو اور جان بچانے کی خاطر دو دشمنوں کو ہلاک کیا ہے۔ جبکہ وہ دو دشمن آپ کے رشتے دار ہیں۔ انہیں دشمن ثابت کرنا ہوگا۔ کیس ذرا بھی کمزور ہوگا تو آپ کی صاحبزادی قانون کی گرفت میں آجائے گی۔“

جمشید نے پوچھا۔ ”آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”آپ اپنی صاحبزادی کے ساتھ کم از کم دو دن تک اسلام آباد میں رہیں۔ ہماری تفتیش مکمل ہوجائے گی۔ کیس آپ کی صاحبزادی کے حق میں مضبوط ہوجائے گا، تب آپ لاہور جاسکتے ہیں۔“

فردا کامران سے ملنے کے لیے بے چین تھی لیکن قانونی کارروائی کے باعث اسے اسلام آباد میں رکنا پڑا۔ اس نے باپ کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں آکر فون پر اس کے نمبر پنچ کیے۔ اسے کان سے لگایا۔ چند لمحوں کے بعد ریکارڈنگ سنائی دی کہ اس کا مطلوبہ نمبر بند ہے۔

اس نے حیرانی سے سوچا۔ ”یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ فون ہمیشہ کامران کے پاس رہتا ہے۔ وہ بے قراری سے میری کال کا انتظار کرتا ہے۔“

اس نے دوسری پھر تیسری بار اس کے نمبر پنچ کیے۔ ہر بار یہی کہا گیا کہ وہ نمبر بند ہے۔ اب وہ کیا کرسکتی تھی؟ مزید دو دن تک صبر کرنا تھا۔ بیچاری جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

دو ہفتوں کی جدائی میں کامران کے حالات بدل گئے۔ اس نے فردا کی بات مان کر گیراج کا کام چھوڑ دیا تھا۔ دو ہفتے کی بیروزگاری نے اسے کنگال بنا دیا تھا۔ اس نے عارضی طور پر کسی دکان میں کام کرنا چاہا تو کہیں کام نہ ملا۔

ایک روز وہ بس میں سفر کررہا تھا۔ اسے اپنے حالات پریشان کررہے تھے۔ پھر فردا کی فکر تھی۔ فون کے ذریعے اس سے رابطہ نہیں ہورہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے اغوا کیا گیا ہے اور اس سے فون چھین لیا گیا ہے۔

ایسی ہی فکر و پریشانی میں بس سے اترتے وقت وہ اپنا بیگ وہاں سے اٹھانا بھول گیا۔ جب وہ بس دور نکل گئی تو خیال آیا کہ بیگ ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس نے بس کے پیچھے دوڑ لگائی۔ وہ اور آگے نکل گئی اور اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

جب وہ سورج کی تپش سے جھلستا ہوا بس اڈے پر پہنچا تو وہ خالی ہوچکی تھی۔ مسافر جاچکے تھے اور کوئی فون سمیت اس کا بیگ لے جاچکا تھا۔ یہ وہی وقت تھا، جب وہ مسجد جامعہ اشرفیہ میں جاکر نماز پڑھا کرتا تھا اور نہر کنارے ایک فقیر بابا سے ملاقات ہوئی تھی۔

بابا نے اسے تین باتیں بتائی تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ لاوارث نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ کروڑوں کی جائداد کا مالک ہے اور تیسری حقیقت یہ کہ اس کی محبوبہ بچھڑ گئی ہے لیکن جلد ہی ملے گی۔

آخر میں اس نے کہا تھا کہ آج کا دن اس پر بھاری ہے۔ اسے گھر سے نہیں نکلنا چاہیے۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی تڑاتڑ دو فائر ہوئے تھے۔ کار میں بیٹھا ہوا کوئی دشمن کامران کو قتل کرنا چاہتا تھا مگر اس کی موت بابا کے حصے میں آئی تھی۔ اس کے نصیب میں زندگی تھی۔ وہ ابھی سانسیں لے رہا تھا۔

وہ بابا کی ہلاکت کے سلسلے میں تھانے جا کر اپنا بیان لکھوانے کے بعد گھر واپس جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ''فردا کے کزنز میرے رقیب ہیں۔ ان ہی میں سے کسی نے مجھ پر گولیاں چلائی ہوں گی نتیجے میں بیچارہ بابا مارا گیا۔''

جب وہ گھر کے قریب پہنچا تو ایک بہت ہی مہنگی سفید ٹویوٹا کرولا کو دیکھا۔ وہ دھوپ میں چمچما رہی تھی۔ اس کا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ دھڑکتے ہوئے دل نے کہا۔ ''فردا ایک نئی کار میں آئی ہے۔''

وہ تیزی سے چلتا ہوا گھر کا دروازہ کھول کر اندر آیا تو اس کی محبوبہ نہیں تھی۔ ایک خاتون اور ایک ادھیڑ عمر شخص اپنے جوان بیٹے کے ساتھ چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھتے ہی خاتون اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

نانی نے کہا۔ ''یہ تمہاری امی ہیں اور یہ تمہارے ابو ہیں۔ بڑی مشکل سے مجھے تلاش کر کے یہاں تک پہنچے ہیں۔''

باپ چارپائی سے اٹھ کر دونوں بازو پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''بیٹے! میرے سینے سے لگ جاؤ۔ آج کے بعد تم لاوارث نہیں کہلاؤ گے۔''

وہ باپ کے گلے لگ گیا۔ اس نے دیکھا، ماں اسے دیکھ رہی تھی اور رو رہی تھی۔ جیسے چھونے کے لیے تڑپ رہی ہو۔ وہ باپ سے الگ ہو کر ماں کے پاس آ کر بولا۔ ''امی...!''

وہ خوشی سے لبریز اس سے لپٹ گئی۔ وہ بڑے ہی جذباتی لمحات تھے۔ کامران شکایت کرنا بھول گیا کہ اسے پیدا کرنے کے بعد کیوں ایک لاوارث کی طرح چھوڑ دیا گیا تھا؟

وہ زندگی میں پہلی بار باپ اور ماں کے گلے لگ رہا تھا۔ ان کے وجود سے نکل کر ان کی بے قرار دھڑکنوں کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کر رہا تھا۔

باپ نے کہا۔ ''بیٹے! ہم نے حالات سے مجبور ہو کر تم سے ناانصافی کی ہے۔ اب ہمارے سامنے کوئی رکاوٹ، کوئی مجبوری نہیں ہے۔ ہم اعلان کریں گے کہ تم ہمارے بیٹے ہو۔ بچپن میں ہم سے بچھڑ گئے تھے۔ اب تمہارے تمام جائز حقوق تمہیں ملیں گے۔''

ماں نے کہا۔ ''تم ابھی ہمارے ساتھ چلو اور ہمارے ساتھ رہو۔ یہ تمہارا چھوٹا بھائی عدنان ہے۔ اکثر تمہارے بارے میں پوچھتا رہتا ہے۔ بہت محبت کرنے والا بھائی ہے۔ یہ تمہیں لینے آیا ہے۔''

کامران نے عدنان کو گلے لگا کر پیار کیا۔ وہ قد میں اس کے برابر تھا۔ عمر میں اس سے دو برس چھوٹا ہو گا۔ اس نے کہا۔ ''بھائی! گھر چلیں۔ میں نے آپ کے کمرے کو اپنے ہاتھوں سے سجایا ہے۔ آپ کو پسند آئے گا۔''

''بیٹے! میرا نام صادق حسین ہے۔ آج سے تم کامران ولد صادق حسین ہو۔''

ماں نے کہا۔ ''میرا نام آمنہ حسین ہے۔ قیامت کے دن تمہیں میرے نام سے پکارا جائے گا۔ میں بہت مجبور ہو کر تمہارے ابو سے بچھڑ گئی تھی۔ خاندان کے ایک جوان سے زبردستی میری شادی کر دی گئی۔ دو برس بعد عدنان پیدا ہوا۔ اس کے بعد میں نے قسم کھائی کہ جب تک تمہارے تمام حقوق ادا نہیں کروں گی مزید کوئی اولاد پیدا نہیں ہو گی۔''

اس نے عدنان کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''یہ اپنے باپ سے نفرت کرتا تھا۔ وہ شرابی اور عیاش تھا۔ اسے بھی باپ کا پیار نہیں ملا۔ وہ شرابی عیاش دو برس پہلے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ میں بیوہ ہو گئی۔ آزاد ہو گئی۔ میرے خاندان میں جو بزرگ ہمارے مخالف تھے۔ وہ سب اپنی مخالفتوں کے ساتھ مٹی میں مل گئے۔ اس کے بعد مجھے صادق کی منکوحہ بننے سے کوئی نہیں روک سکا۔''

صادق نے کہا۔ ''میں لندن میں اپنا کاروبار سنبھال رہا تھا۔ تمہاری امی سے فون پر رابطہ تھا۔ یہ بیوہ ہونے کے تین ماہ بعد لندن آ گئیں۔ وہاں ہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ فوراً ہی پاکستان جا کر تمہیں گلے لگائیں گے اور اعلانیہ تمہیں اپنی اولاد تسلیم کریں گے۔''

ماں نے کہا۔ ''لیکن ہم فوراً ہی نہ آ سکے۔ تم نے اخبارات میں پڑھا ہو گا، لندن میں جو بم دھماکا ہوا تھا۔ اس کے الزام میں مسلمانوں کو دہشت گرد کہہ کر گرفتار کیا جا رہا تھا۔ انہوں نے میرے عدنان کو بھی دہشت گردی کے جھوٹے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔''

صادق حسین نے کہا۔ ''ہم کافی عرصے...... تک مقدمہ لڑتے رہے۔ خدا کا شکر ہے عدنان کو الزام سے بری کر دیا گیا ہے۔ پاکستان آنے کے بعد میں نے بڑی مشکل سے یہاں کا پتا معلوم کیا اور آج تم سے مل رہے ہیں۔''

ماں نے کامران کے سینے سے لگ کر کہا۔ ''ہم خدا کا جتنا بھی شکر ادا کریں، کم ہے۔ ہماری پہلی اور آخری خواہش یہی تھی کہ تمہیں اپنا نام دیں۔ یہ خواہش بھی پوری ہو چکی ہے۔ ہم پورے خاندان میں یہ اعلان کر چکے ہیں کہ اپنے بڑے بیٹے کو لینے جا رہے ہیں۔''

باپ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''چلو بیٹے! وہاں ہمارا پورا خاندان تمہارا انتظار کر رہا ہے۔''

کامران نے نانی کو گلے لگا کر کہا۔ ''میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں اور اسپتال کی ملازمت چھوڑ دیں۔''

وہ بولی۔ ''نہیں بیٹے! مجھے یہیں رہنے دو۔ تمہارے ابو نے وعدہ کیا ہے، آئندہ مجھے دس ہزار روپے ماہانہ دیا کریں گے۔ یہ میرے لیے بہت ہیں۔ تم جاؤ اپنے والدین کے ساتھ نیک نامی کی زندگی گزارو۔''

وہ ان کے ساتھ کار میں آ کر بیٹھ گیا۔ ان لمحات میں یہ سوچ کر دل مسرتوں سے بھر گیا کہ اب فردا کے والدین اسے لاوارث نہیں کہیں گے۔ وہ بڑے فخر سے ایک اونچے گھرانے کا شجرہ پیش کر سکے گا۔

وہ گلبرگ کی ایک عالی شان کوٹھی میں پہنچا تو وہاں رشتے داروں کا میلا لگا ہوا تھا۔ سب اسے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ہر ایک سے تعارف کرایا جا رہا تھا کہ کون رشتے میں اس کا کیا لگتا ہے؟ وہ اتنی تعداد میں تھے کہ کامران ان کے نام یاد نہیں رکھ سکتا تھا۔

آخر میں ایک شخص سے تعارف کرایا گیا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ ماں نے کہا۔ ''بیٹے! ان سے ملو! یہ جبار ہمدانی ہیں اور یہ ان کی بیٹی ماہم ہے۔ ہم نے عدنان کے لیے اسے مانگا ہے۔ بس تمہارا انتظار تھا۔ اب دھوم دھام سے منگنی کریں گے۔''

بیٹی جتنی خوبصورت تھی، باپ صورت سے اتنا ہی جابر اور سنگدل دکھائی دیتا تھا۔ کامران سے مصافحہ کرتے وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

یوں نہ مسکرانے کے پیچھے ایک خطرناک معاملہ تھا۔ جبار نے جب اپنی بیٹی کے لیے عدنان کا رشتہ قبول کیا تو یہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں سے لندن تک پھیلی ہوئی دولت اور جائداد میں عدنان کا ایک حصے دار بھائی بھی ہے۔

یہ بات جبار ہمدانی کو گوارا نہیں تھی۔ اس نے کئی برس پہلے اپنے کاروبار میں سے دو بھائیوں کی حصے داری ختم کرنے کے لیے بڑی رازداری سے انہیں مروا دیا تھا۔ اب اس کاروبار کا بلاشرکت غیرے مالک بن گیا تھا۔

پولیس کو اس پر شبہ تھا لیکن وہ کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر اسے گرفتار نہ کر سکے۔

اب اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کی بیٹی عدنان کے ذریعے جس دولت اور جائداد کی مالک بننے والی ہے، اس کا حصے دار کامران بن جائے۔

جس دن کامران اپنے والدین کے ساتھ اپنی عالی شان کوٹھی میں آنے والا تھا اور تمام رشتے دار اسے خوش آمدید کہنے والے تھے۔ اس سے دو روز پہلے جبار نے معلوم کیا تھا کہ کامران فجر کی نماز ادا کرنے مسجد اشرفیہ.... جاتا ہے اور نہر والے گیٹ سے باہر آ کر چہل قدمی کرتا ہے۔

وہ مناسب جگہ تھی۔ صبح کے وقت ادھر لوگوں کی آمد و رفت کم سے کم ہوتی تھی۔ زبیر نامی ایک شخص اس کا دست راست تھا۔ خفیہ معاملات میں اس کا رازدار بھی تھا۔ اس نے کرائے پر ایک مہنگی کار حاصل کی تھی اور اسے ڈرائیو کر رہا تھا۔ جبار ہمدانی گن لیے فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔

اس نے دور سے دیکھا کہ کامران ایک فقیر بابا کے روبرو کھڑا ہے۔ اس نے اپنی دانست میں اچھی طرح جم کر کامران کا نشانہ لیا لیکن تیز رفتار گاڑی میں بیٹھ کر مہارت رکھنے والے ہی صحیح نشانے پر گولی چلاتے ہیں اور وہ ماہر نہیں تھا۔ دو فائر کرتا ہوا گزر را۔ ان میں سے ایک گولی ضائع ہو گئی اور دوسری فقیر بابا کو لگی۔

کامران کے نصیب میں زندگی تھی۔ اب جبار ہمدانی اسے زندہ سلامت دیکھ رہا تھا اور ان لمحات میں کامران سوچ رہا تھا۔ ''بابا کی باتیں کتنی سچی تھیں؟ اس نے کہا تھا' میں لاوارث نہیں رہوں گا اور کہا تھا، کروڑوں کی جائداد کا مالک ہوں۔ یہ دونوں پیش گوئیاں درست ثابت ہوئی ہیں۔''

پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔ ''میری فردا جلد ہی مجھے ملے گی، یہ بابا کی تیسری پیش گوئی تھی۔ ابھی خدا جانے کہاں ہو گی؟ میں نے کئی بار فون پر رابطہ کرنے کی کوششیں کیں۔ پتا نہیں، اس کا فون کیوں بند تھا؟ اب میرا فون گم ہو گیا ہے۔ وہ رابطہ کرے گی تو میری طرح مایوس ہوتی رہے گی۔''

شام تک رشتے داروں کی بھیڑ چھٹ گئی۔ جبار نے

آمنہ اور صادق حسین سے کہا۔ ’’جتنی جلدی ہو سکے، عدنان اور ماہم کی منگنی کی رسم ادا کی جائے۔ میں چاہوں گا، اسی سال ان کی شادی ہو جائے۔‘‘

کامران نے کہا۔ ’’ابو! میں نے اپنے لیے ایک شریکِ حیات پسند کی ہے۔ میں چاہتا ہوں، آپ اور امی اسے دیکھ لیں۔ اس کے والدین سے ملاقات کریں۔ پھر ایک ہی دن ہم دونوں بھائیوں کی منگنی کر دی جائے۔‘‘

انہوں نے خوش ہو کر پوچھا۔ ’’لڑکی کا نام کیا ہے؟ اس کے والد کے متعلق بتاؤ؟‘‘

’’اس کا نام فردا جمال ہے اور اس کے والد جمال جمشید بہت بڑے بزنس مین ہیں۔‘‘

صادق حسین نے کہا۔ ’’وہ تو میرے شناسا ہیں۔ جب بھی لندن آتے ہیں، مجھ سے ملاقات ضرور کرتے ہیں۔ ہم کل ہی ان سے ملنے جائیں گے۔‘‘

جبار نے کہا۔ ’’آپ ان سے ملیں، رشتہ طے کریں پھر منگنی کی رسومات کے لیے تاریخ مقرر کی جائے گی۔‘‘

ماہم باہر لان میں عدنان سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ دونوں اسکول کے زمانے سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ ان کی محبت کالج میں پروان چڑھتی ہوئی رشتۂ ازدواج تک پہنچنے والی تھی۔ وہ دونوں بہت خوش تھے۔

جبار ہمدانی نے پورچ میں کار کے پاس آ کر آواز دی۔ ’’کم آن ماہم! ہم گھر جا رہے ہیں۔‘‘

عدنان نے ماہم سے کہا۔ ’’جاؤ۔ میں رات کو کال کروں گا۔‘‘

وہ باپ کے ساتھ کار میں آ کر بیٹھ گئی۔ وہ ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی کے احاطے سے باہر آیا۔ پھر بولا۔ ’’یہ جو تمہارے عدنان کا گمشدہ بھائی آیا ہے۔ یہ جمال جمشید کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یعنی اس گھر میں تمہارے مقابلے پر ایک بڑی بہو ہوگی۔ میں نے تو یہ سوچ کر تمہارا رشتہ کیا تھا کہ وہاں تم اکیلی راج کرو گی۔‘‘

’’کوئی بات نہیں ڈیڈ! عدنان مجھے بہت چاہتا ہے۔ بس مجھے اس کی محبت چاہیے۔‘‘

’’محبت سے پیٹ نہیں بھرتا۔ کتنی ہی خواہشیں بھوکی رہ جاتی ہیں۔ تمہاری ایک الگ حیثیت نہیں ہوگی۔ تم اپنی ہر ضرورت، ہر خواہش پوری نہیں کرو گی۔ وہاں بڑی بہو سے کمتر رہو گی تو یہ میرے مزاج کے خلاف ہوگا۔ مجھے کچھ کرنا ہی ہوگا۔‘‘

پھر اس نے دل میں سوچا۔ ’’کیا تو تھا، کم بخت قسمت کا دھنی ہے، بچ گیا۔‘‘

ماہم نے پوچھا۔ ’’ڈیڈ! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟‘‘

’’کچھ نہیں یہ میرا معاملہ ہے۔ میں نمٹ لوں گا۔‘‘

’’یہ آپ کا نہیں، میرا معاملہ ہے۔ مجھے ساری زندگی عدنان کے ساتھ گزارنی ہے۔‘‘

’’تم نادان ہو۔ یہ نہیں جانتیں کہ خود کو برتر بنائے رکھنے کے لیے اپنے کسی معاملے میں کسی کو حصے دار نہیں بنانا چاہیے۔‘‘

’’جس طرح آپ نے اپنے بھائیوں کو کاروبار میں اور میرے دادا کی جائداد میں حصے دار نہیں بنایا، انہیں گولی مار دی؟‘‘

باپ کے لیے یہ چونکا دینے والی بات تھی کہ اتنا اہم راز بیٹی کیسے جانتی ہے؟

اس نے فوراً ہی کار کی رفتار دھیمی کرتے ہوئے اسے سڑک کے کنارے روکا۔ پھر بیٹی کو گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ’’یہ تم کیا بکواس کر رہی ہو؟‘‘

وہ بولی۔ ’’ڈیڈ! ہم تنہا ہیں، یہاں کوئی تیسرا نہیں ہے اور میں دشمن نہیں ہوں، آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ کی کوئی بات عدنان کے سامنے بھی میری زبان پر نہیں آئے گی۔‘‘

وہ خوشی سے جھوم کر بیٹی کی پیشانی کو چوم کر بولا۔ ’’تم سو فیصد میرا لہو ہو۔ مجھ پر گئی ہو۔ میں تم پر فخر کرتا ہوں۔ اب تم دیکھو گی، میں تمہارے عدنان کے کسی حصے دار کو اس خاندان میں رہنے نہیں دوں گا۔‘‘

’’آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔۔۔؟‘‘

وہ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ’’پہلے یہ بتاؤ، تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں نے اپنے بھائیوں کو راستے سے ہٹایا ہے؟‘‘

’’یہ دو روز پہلے کی بات ہے۔ آدھی رات کے بعد میرے سر میں درد ہو رہا تھا، طبیعت گھبرا رہی تھی۔ ایسے وقت میں آپ کے پاس آ جاتی ہوں۔ آپ ڈاکٹر کو کال کرتے ہیں۔ میرا دل بہلاتے ہیں۔

اس رات میں آپ کی کھڑکی کے پاس آ کر رک گئی۔ آپ فون پر زبیر انکل سے باتیں کر رہے تھے۔ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں اپنے کمرے میں سو رہی ہوں۔ اب آپ خود سمجھیں کہ اس وقت کیا باتیں کر رہے تھے؟‘‘

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ’’جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ عدنان کا ایک اور بھائی کامران ہے اور وہ آدھی جائداد کا حصے دار بننے کے لیے آ رہا ہے تو میرا سکون برباد ہو گیا۔ میں تمہیں اس گھرانے کی واحد مالکن بنانا چاہتا ہوں اور وہ کباب میں ہڈی بن رہا ہے۔‘‘

وہ کار کو ایک راستے پر موڑتے ہوئے بولا۔ ’’میں فون پر زبیر سے کہہ رہا تھا جس طرح میں نے حصے دار بننے والے بھائیوں کو اپنے راستے سے ہٹایا ہے۔ اسی طرح میں اپنے داماد کے کسی حصے دار کو برداشت نہیں کروں گا۔‘‘

’’آپ میری بہتری کے لیے بول رہے تھے اور صرف زبیر انکل کو رازدار بنا رہے تھے۔ میں نے اس معاملے میں مداخلت نہیں کی۔ واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔‘‘

وہ اسٹیئرنگ پر باپ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ’’اتنا تو سمجھتی ہوں کہ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے اپنے مال کی اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ایسے معاملات میں شوہر کے سوا کسی کو شریک نہیں کرنا چاہیے۔‘‘

’’شاباش بیٹی! تم باپ کے نقشِ قدم پر چلتی رہو گی تو سسرال میں صرف تمہاری حکمرانی رہے گی۔ عدنان اپنے والدین کا تنہا وارث ہوگا۔ اس طرح صرف تم اور تمہارے بچے کروڑوں کی دولت اور جائداد سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔‘‘

’’میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ ہی کی طرح زندگی گزاروں گی۔ بس میرے عدنان کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔‘‘

’’اسے کبھی کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچے گا۔ وہ میرا ہونے والا داماد ہے۔ مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔‘‘

یہ انسانی فطرت ہے، اپنا مفاد حاصل کرنے کے لیے ناجائز راستہ آسان ہو تو اسے جائز سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور جو ایسا سمجھ لیتا ہے، اسے آسمانی ہدایات بھی سمجھا نہیں پاتیں۔ جرائم کی راہیں اسی طرح ہموار ہوتی چلی جاتی ہیں۔

دوسرے دن کامران اپنے والدین کے ساتھ جمال جمشید کی کوٹھی پہنچا تو گیٹ پر سیکیورٹی گارڈ نے کہا۔ ’’یہاں کوئی نہیں ہے۔ سب ہی اسلام آباد میں ہیں۔ کل یا پرسوں تک آئیں گے۔‘‘

صادق حسین نے کہا۔ ’’جمال جمشید کا فون نمبر بتاؤ۔ ہم ان سے بات کریں گے۔‘‘

گارڈ نے کہا۔ ’’ہمیں اپنا نمبر دیں۔ ہم صاحب تک آپ کا نمبر اور پیغام پہنچا دیں گے۔ پھر وہ چاہیں گے تو خود ہی آپ سے رابطہ کریں گے۔‘‘

صادق نے اپنا نمبر بتایا اور کہا۔ ’’ان سے کہو، لندن سے ان کا ایک شناسا صادق حسین آیا ہے۔ ان سے ابھی بات کرنا چاہتا ہے۔‘‘

اُدھر فردا اپنے والدین اور رشتے داروں کے ساتھ اسلام آباد میں تھی۔ اس کے ساتھ جو واردات ہوئی تھی، اس سلسلے میں انہیں دو دن کے لیے وہاں روک لیا گیا تھا۔

لیکن دو دن کے بجائے چار دن لگ گئے۔ ہوا یہ کہ جواد پشاور کے راستے سرحد پار کر کے افغانستان جاتے ہوئے پکڑا گیا۔ اسے اسلام آباد پہنچا دیا گیا۔ اس نے فردا کے سامنے اپنا جرم قبول کر لیا۔

فردا کا کیس مضبوط ہو گیا۔ اگرچہ اس نے دو قتل کیے تھے مگر اپنی حفاظت کی خاطر کیے تھے۔ انہیں لاہور جانے کی اجازت دے دی گئی۔

ایسے ہی وقت ان کے سیکورٹی گارڈ نے صادق حسین کا نمبر اور پیغام پہنچایا۔ جمال جمشید نے اس نمبر پر رابطہ کیا پھر پوچھا۔ ’’ہیلو حسین صاحب! کیا آپ لاہور آئے ہوئے ہیں؟‘‘

صادق نے کہا۔ ’’میں آپ کے دروازے سے واپس جا رہا ہوں۔‘‘

’’میں آج شام تک آ رہا ہوں۔ آپ کا قیام جہاں بھی ہے، وہاں آ کر ملاقات کروں گا۔‘‘

’’آپ نہ آئیں۔ میں اپنے بیٹے کے ساتھ آپ کے گھر آؤں گا۔ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ کامران میرا بیٹا ہے، جسے آپ لاوارث سمجھ رہے ہیں۔‘‘

وہ حیرانی سے بولا۔ ’’کیا واقعی آپ کامران کے والد ہیں؟‘‘

’’جی ہاں۔ میں اس کی والدہ کے ساتھ آپ کے گھر رشتہ مانگنے آؤں گا اور خاندانی شجرہ بھی پیش کروں گا۔‘‘

’’شرمندہ نہ کریں۔ بھلا آپ کے خاندان کو کون نہیں جانتا؟ میں لاہور پہنچتے ہی آپ کو فون کروں گا۔‘‘

پھر فردا کی آواز سنائی دی۔ ’’انکل! السلام علیکم۔ میں آپ کے دوست کی بیٹی فردا بات کر رہی ہوں۔‘‘

صادق نے سلام کا جواب دے کر کہا۔ ’’میرا بیٹا تمہارے گم ہونے پر بہت پریشان ہے۔ لو اس سے بات کرو۔‘‘

فردا نے چند لمحوں میں دھڑکتے ہوئے دل سے کامران کی آواز سنی۔ ’’ہیلو فردا! کیسی ہو؟ کہاں گم ہو گئی تھیں؟ میں نے کئی بار رابطہ کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔ پھر میرا اپنا فون گم ہو گیا۔‘‘

وہ بولی۔ ”تقدیر میں جو پریشانیاں لکھی ہوتی ہیں، انہیں جھیلنا ہی پڑتا ہے۔ کیا تم نے نیا فون لیا ہے؟“

”ہاں۔ تم اپنا نیا نمبر بتاؤ۔ میں ابھی کال کروں گا۔“

اس نے اپنا نمبر بتا کر رابطہ ختم کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنے ذاتی فون پر آدھی ملاقات کی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے طویل مدت کے بعد ایک دوسرے کی آوازیں سن رہے ہوں۔

فردا نے اسے اپنی روداد سنائی تو وہ حیرت اور مسرت سے بولا۔ ”تم نے واقعی غیر معمولی دلیری دکھائی ہے۔ یہ سن کر بھی یقین نہیں ہو رہا ہے کہ تم نے تنہا تین دشمنوں کو زیر کیا۔ دو کو موت کے گھاٹ اتارا اور ایک کو قانون کی گرفت میں پہنچا دیا۔ میں تم پر فخر کرتا ہوں۔“

پھر کامران نے اپنی روداد سنائی کہ اس پر بھی کسی انجانے دشمن نے گولیاں چلائی تھیں لیکن وہ فردا کو خوشیاں دینے کے لیے زندہ سلامت ہے۔

پھر اس نے بتایا کہ اس کے بچھڑے ہوئے ماں باپ کس طرح اچانک مل گئے ہیں؟ اس کے لیے سب سے خوش آئند بات یہ ہے کہ اب کوئی اسے لاوارث نہیں کہے گا۔

وہ گھنٹوں فون پر باتیں کرتے رہے۔ پھر شام کو روبرو ملاقات ہوئی۔ کامران پہلی بار اپنے والدین کے ساتھ ان کی کوٹھی میں آیا۔ اس کوٹھی میں فردا کی پھوپھی اور ماموں کا داخلہ ممنوع ہو چکا تھا۔ باقی جو رشتے دار تھے، وہ کامران کا موجودہ اسٹیٹس دیکھ کر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

جمال جمشید نے صادق حسین سے کہا۔ ”میری بیٹی نے مجھے بتایا ہے کہ کامران آپ سے کیسے بچھڑ گیا تھا؟ آپ کے ساتھ اور کامران کی والدہ کے ساتھ کیسے کیسے حالات پیش آتے رہے، یہ روداد میں نے سن لی ہے۔ میں کامران کو دل سے قبول کرتا ہوں۔“

فی الحال کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ اگر کوئی تھی تو ابھی در پردہ تھی۔ ابھی تو جتنے بولنے اور ڈھولک کی تھاپ پر سہاگ کے گیت گانے کے دن آ گئے تھے۔

تمام بزرگوں نے یہ طے کیا کہ منگنی نہ کی جائے۔ اپنے بچوں کی شادی کر دی جائے۔ بچے کہلانے والے جوان خوش ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہی اُن کے من کی مرادیں پوری ہو رہی تھیں۔

آمنہ اور صادق حسین ایک دن کامران کی برات لے کر گئے اور فردا کو بہو بنا کر لے آ گئے۔ دوسرے دن عدنان کی برات جبار کے دروازے پر گئی۔ دوسری بہو ماہم بھی آ گئی۔

فردا اور کامران نے بڑے حوصلے سے عداوتیں کرنے والوں کو زیر کیا تھا۔ ایک تھکا دینے والے انتظار کے بعد سہاگ کی پھولوں بھری سیج تک پہنچے تھے۔ وہ بڑے ارمانوں سے گھونگھٹ میں منہ چھپائے بیٹھی تھی۔

کامران نے اس ماڈرن لڑکی کو روزے نماز کے علاوہ حجاب میں رہنا سکھایا تھا۔ وہ سچ مچ گھونگھٹ کے پیچھے شرما رہی تھی۔ کامران نے اس کے پاس آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”فردا! ہم اتنے دنوں تک پاس رہ کر بھی دور دور رہے۔ کبھی کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے تھے۔ اب صبر نہیں ہوگا۔ میں کوئی رسمی گفتگو نہیں کروں گا۔“

اس نے یہ کہتے ہی گھونگھٹ کو الٹ دیا۔ اسے کھینچ کر اپنی دھڑکنوں سے لگا لیا۔ وہ بھی بے قرار تھی۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ اس کی آغوش میں کھلتی چلی گئی۔

وہ محض دو چار منٹ کی قربت تھی۔ اس کے بعد اچانک ہی رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ باہر سے کوئی عداوت کرنے نہیں آیا تھا۔ وہ خود ہی اس سے الگ ہو گئی۔

کامران نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

وہ شرماتے اور ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”پلیز آپ تھوڑی دیر کے لیے باہر چلے جائیں۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیوں...؟“

وہ بولی۔ ”پلیز۔ کوئی سوال نہ کریں۔“

وہ بیڈ سے اترتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ دلہن اپنے دولہا کو حجلۂ عروسی سے بھگا دیتی ہے۔“

وہ دروازے کے باہر جاتے ہوئے بولا۔ ”کوئی بات نہیں۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔“

وہ بیڈ روم سے نکل کر باہر آکر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا۔ ”یہ کیا بات ہوئی؟ وہ کمرے میں کیا کر رہی ہے؟ ویسے کچھ بھی کر رہی ہے، مجھ سے کیوں چھپا رہی ہے؟“

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ یہ سچ ہے، عورت ایک پہیلی ہے۔ اسے بوجھتے بوجھتے زندگی گزر جاتی ہے۔

آدھے گھنٹے کے بعد دروازہ کھل گیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا اندر آیا۔ فردا لباس بدل چکی تھی۔ سر جھکا کر اس کے سینے سے لگ گئی، وہ اس کے چہرے پر جھک کر بولا۔ ”ایک لباس بدلنے کے لیے مجھے باہر کر دیا تھا؟“

اس نے دھیمی سی سرگوشی کی۔ سرگوشی ایسی تھی کہ وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ ساحل پر تھا اور بہتی ہوئی ندیا کہہ رہی تھی۔ ”پیاسے رہو۔“

ماہم اور عدنان کے نصیب میں ازدواجی مسرتیں تھیں۔ ماہم پر سحر طاری ہو گیا۔ اس نے سہیلیوں سے سنا تھا، کتابوں میں پڑھا تھا کہ سہاگ کی پہلی رات ایسی ہوتی ہے، جسے عورت کبھی بھول نہیں پاتی۔

وہ سوچ رہی تھی۔ ”عدنان کی قربت میں یہ کیسی جادوگری ہے؟“

وہ اب تک باپ سے زیادہ متاثر تھی۔ عدنان کی حیثیت ثانوی تھی۔ اس رات عدنان اہم ہو گیا، باپ پسِ پشت چلا گیا۔

جبار ہمدانی فی الحال خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔ وہ اپنے منصوبے کے مطابق مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ یہ کامران کی خوش نصیبی تھی کہ اس کے ہتھے نہیں چڑھ رہا تھا۔

ماہم باپ کے ارادوں کو سمجھ رہی تھی۔ از راہِ انسانیت کسی طرح کا اعتراض نہیں کر رہی تھی۔ کیونکہ باپ جو کچھ کر رہا تھا، اس کی بہتری کے لیے ہی کر رہا تھا۔

شادی کے پانچویں دن فردا میکے گئی۔ وہ اور کامران کنوارے بیاہتا تھے۔ وہ اس سے پوچھتا رہتا۔ ”اور کتنا انتظار کراؤ گی۔“

وہ ذرا شرماتے ہوئے بولی۔ ”تھوڑا سا انتظار اور بس...“

وہ بولا۔ ”کل بھی نہیں آتا۔ تم کہہ رہی ہو تو شاید آ جائے۔“

وہ میکے میں تھی۔ فون پر باتیں ہو رہی تھیں۔ عدنان نے آکر کہا۔ ”بھائی! میں اور ماہم ابو کے ساتھ شاپنگ کے لیے جا رہے ہیں۔ آپ بھی چلیں۔“

اس نے پوچھا۔ ”اور امی...؟“

”ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ہم دو چار گھنٹوں میں واپس آ جائیں گے۔ کھانا اور فنگر فش وغیرہ لے کر آئیں گے۔ امی بڑے شوق سے فنگر فش کھاتی ہیں۔“

وہ شاپنگ کے لیے چلے گئے۔ آمنہ ان کے ساتھ نہ جا سکی۔ اپنے بیڈ روم میں آرام سے لیٹی رہی۔ کوٹھی میں اور کوئی نہیں تھا۔ ایسے وقت جبار ہمدانی وہاں پہنچ گیا۔

آمنہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ حیرانی سے بولی۔ ”آپ...؟ آپ دستک دیے بغیر میرے کمرے میں آ گئے۔ کیا بات ہے؟“

وہ بولا۔ ”بات یہ ہے کہ عدنان میرا داماد ہے۔ عدنان کے باپ کے مرتے ہی تم نے دوسری شادی کر لی۔ ایک شوہر کے ساتھ پلا پلایا بیٹا بھی لے آئیں۔“

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ آمنہ کے پاس رکھے ہوئے فون کی کالنگ ٹون سنائی دی۔ جبار نے فوراً ہی ریوالور نکال کر اس کا نشانہ لیتے ہوئے دھمکی دی۔ ”فون اٹینڈ کرو۔ مگر خبردار! کسی سے نہ کہنا، میں یہاں تمہارے کمرے میں ہوں۔“

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”جبار بھائی! یہ آپ کیسی حرکتیں کر رہے ہیں؟“

”زیادہ نہ بولو۔ فون سنو۔ کسی کو شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کوئی بات، کوئی حرکت میرے خلاف ہوگی تو میں گولی مار کر چلا جاؤں گا۔“

آمنہ نے ریوالور کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ پھر فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر پوچھا۔ ”ہیلو کون...؟“

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”میں فردا بول رہی ہوں۔ کامران اپنا فون اٹینڈ نہیں کر رہے ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟“

”بیٹی! وہ اپنے ابو کے ساتھ شاپنگ کے لیے گیا ہے۔ لگتا ہے، فون یہاں بھول گیا ہے۔ واپس آئے گا تو تمہیں کال کرے گا۔“

وہ فون بند کر کے بولی۔ ”جبار بھائی! ریوالور کو سامنے سے ہٹائیں۔ آرام سے بیٹھ کر بات کریں۔ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟“

”کیا اب تک یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی؟ عدنان کے باپ نے جو دولت اور جائداد چھوڑی ہے، میں اس میں کامران کی حصے داری نہیں چاہتا۔“

”آپ جانتے ہیں، عدنان کا باپ عیاش تھا۔ اپنی دولت پانی کی طرح بہا کر گیا ہے۔ یہ جو کروڑوں کی جائداد ہے، وہ میں اپنے میکے سے لائی ہوں۔ پھر یہ کہ میرے شوہر صادق حسین ارب پتی ہیں۔ عدنان کو ان کی جائداد میں سے بھی حصہ ملے گا۔“

جبار نے کہا۔ ”جب کامران اس دنیا میں نہیں رہے گا تو میرا داماد ارب پتی بن جائے گا۔ یہاں صرف میری بیٹی کی حکمرانی رہے گی۔“

”یہ آپ کیا بکواس کر رہے ہیں؟ میرا کامران اس دنیا میں کیوں نہیں رہے گا؟ خدا اسے میری بھی عمر دے۔ آپ کیوں ایسی باتیں کر رہے ہیں؟“

”ابھی یہ صرف باتیں ہیں... مگر افسوس! تم اس کا انجام دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہو گی۔ ویسے کامران سے زیادہ

تمہاری موت ضروری ہے۔ کیونکہ تم زندہ رہوگی تو آئندہ دوسرا تیسرا کامران پیدا کرتی رہوگی۔ تمہاری موت کے بعد میرے داماد کا کوئی حصے دار پیدا نہیں ہوگا۔“

یہ کہہ کر اس نے آمنہ کا نشانہ لیا اور... ٹریگر دبا دیا۔ دھائیں کی آواز کے ساتھ گولی چلی لیکن وہ دوسری طرف چلی گئی۔ عین وقت پر کامران نے اس پر چھلانگ لگادی تھی۔

وہ فردا سے پرسنل گفتگو کرنے کی خاطر اپنا فون لینے کے لیے واپس آیا تھا۔ عین وقت پر اس نے ماں کی جان بچائی تھی۔ چھلانگ لگانے کے نتیجے میں وہ دونوں فرش پر گرے۔ کامران نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔ اس سے ریوالور چھیننے کی کوششیں کررہا تھا۔

وہ نیچے تھا اور کامران اوپر۔ دونوں زور آزمارہے تھے۔ ریوالور کی نال کبھی کامران کی طرف آرہی تھی، کبھی جبار کی طرف جارہی تھی۔ آمنہ بیٹے کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی۔ فون پر نمبر پنچ کررہی تھی۔ رابطہ ہونے پر صادق کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو...!“

وہ چیخ کر بولی۔ ”جلدی آئیں۔ ہمارے بیٹے کی جان خطرے میں ہے۔ یہ جبار ہمدانی پاگل ہوگیا ہے۔ مجھے گولی مارنے آیا تھا۔ عین وقت پر کامران نے آکر مجھے بچالیا مگر اب اس کی جان خطرے میں...“

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ فائر کی زوردار آواز گونجی اور آمنہ کے ہاتھوں سے فون چھوٹ گیا۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔

بیٹا دشمن پر سوار تھا اور ساکت ہوگیا۔ وہ دونوں ہی بے حس و حرکت تھے۔ جیسے موت نے دونوں کو آدبوچا ہو۔

یہ چند لمحوں کا تجسس تھا۔ پھر کامران کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ ریوالور ہاتھ میں لیے آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ آمنہ دوڑتی ہوئی بیٹے سے لپٹ گئی۔ سامنے جبار کی لاش پڑی تھی۔ اس کے سینے سے ابلنے والا لہو فرش پر پھیل رہا تھا۔

بیڈ پر رکھا ہوا فون چیخنے لگا۔ کامران نے اسے اٹھا کر کان سے لگاتے ہوئے بٹن دبایا۔ دوسری طرف سے صادق حسین کہہ رہا تھا۔ ”ہیلو آمنہ! ہیلو... ابھی میں نے گولی چلنے کی آواز سنی ہے۔ ہمارا بیٹا خیریت سے ہے نا؟“

وہ بولا۔ ”جی ابو! یہ جبار ہمدانی امی کو قتل کرنے آیا تھا۔ خدا کا شکر ہے، امی محفوظ ہیں۔ گولی جبار کو لگی ہے۔ یہ مر چکا ہے۔ آپ جلدی آئیں۔“

”میں راستے میں ہوں، بس پہنچنے والا ہوں۔“

صادق حسین کار ڈرائیو کررہا تھا۔ اس نے فون بند کرتے ہوئے عقب نما آئینے میں ماہم کو دیکھا۔ وہ عدنان کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ”ماہم! کیا تمہارا باپ بہت زیادہ نشہ کرنے لگا...؟ وہ ابھی عدنان کی امی کو گولی مارنے آیا تھا۔“

وہ گھبرا گئی، سمجھ گئی کہ باپ واردات کرتے ہوئے اس کے سسرال والوں کی نظروں آ گیا ہے۔ وہ انجان بن کر بولی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

عدنان نے کہا۔ ”جبار انکل خوامخواہ امی سے کیوں دشمنی کریں گے؟“

”کیا تمہاری امی جھوٹ کہہ رہی ہیں؟“

وہ جلدی سے بولا۔ ”نہیں۔ جب امی کہہ رہی ہیں تو بات درست ہوگی۔“

”اگر کامران عین وقت پر نہ پہنچتا تو وہ تمہاری ماں کو گولی ماردیتا۔ اب خود ہی جہنم میں پہنچ گیا ہے۔“

ماہم چیخ پڑی۔ ”نہیں۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

صادق نے کہا۔ ”سوری۔ میں اس کی موت پر افسوس نہیں کروں گا۔ وہ موت کا جو گڑھا کھودنے آیا تھا، اس میں خود گر چکا ہے۔“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میں ڈیڈی کے پاس جاؤں گی۔“

صادق نے کہا۔ ”ہم وہیں جارہے ہیں۔“

وہ روتے ہوئے عدنان کے بازو سے لگ گئی۔ عدنان نے بڑی آہستگی سے اسے ہٹایا پھر ذرا پیچھے ہٹ کر بولا۔ ”مجھ سے دور رہو۔ پہلے میں اپنی ماں کی زبان سے سچ سنوں گا۔ اس کے بعد تم اپنے باپ کی لاش کے ساتھ میکے جاؤ گی۔ پھر واپسی کا راستہ بھول جاؤ گی۔“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”ایسے وقت تمہیں تسلی دینی چاہیے اور تم دل توڑنے والی بات کررہے ہو؟“

”تم میری ماں کے دشمن کی بیٹی ہو۔ یہی بہت ہے کہ ابھی تمہیں اپنے قریب برداشت کررہا ہوں۔“

اسی اثنا میں وہ کوٹھی پہنچ گئے۔ ماہم دوڑتی ہوئی اسی کمرے میں آئی۔ پھر باپ کی لاش کے پاس گر کر رونے لگی۔ آمنہ نے عدنان کو بتایا کہ جبار اس ارادے سے قتل کرنے آیا تھا کہ آئندہ وہ کوئی اولاد پیدا نہ کرے۔ وہ کروڑوں اربوں کی جائداد میں عدنان کا حصے دار نہیں چاہتا تھا۔ کامران کو بھی قتل کرنے کا ارادہ کرچکا تھا۔

صادق حسین نے فون کے ذریعے پولیس کو اس سانحے

کی اطلاع دی۔ کامران فردا کو فون پر بتا چکا تھا کہ وہاں کیسی واردات ہوچکی ہے؟ فردا نے اپنے باپ کو بتایا کہ کامران مشکل میں پڑنے والا ہے۔

وہ باپ بیٹی ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر وہاں پہنچے تو پولیس ان سے پہلے پہنچ گئی تھی۔ اپنے طور پر کارروائی کررہی تھی۔ انہوں نے کامران کو حراست میں لے لیا تھا۔

جمال جمشید نے ہوم منسٹر سے رابطہ کیا۔ اسے بتایا کہ اس کا داماد کس قدر نیک سیرت اور عبادت گزار ہے... کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اس دیندار نوجوان کی سفارش کی جائے۔

ہوم منسٹر نے پولیس افسر سے فون پر بات کی۔ افسر نے کہا۔ ”سر! یہ ثابت ہونا چاہیے کہ مقتول ریوالور لے کر قتل کرنے کی نیت سے آیا تھا۔ جبکہ وہ اس گھر میں اپنی بیٹی کو دلہن بنا چکا ہے۔ وہ اس گھر میں واردات کرنے کیوں آئے گا؟ اس واردات کے اور بھی بہت سے پہلو جواب طلب ہیں۔ ہمیں مجبوراً کامران کو حراست میں رکھنا ہوگا۔ آپ چاہیں تو کل عدالت سے ضمانت نامہ حاصل کرکے اسے عارضی رہائی دلا سکتے ہیں۔“

لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا گیا۔ اونچی سفارش کے باعث کامران کو ہتھکڑی نہیں پہنائی گئی لیکن اسے حوالات پہنچادیا گیا۔

فردا رونے لگی تھی۔ باپ نے تسلی دی کہ اسے ضمانت پر رہا کرالیا جائے گا۔ لیکن قتل کی واردات تھی۔ جب تک پولیس کی تفتیشی رپورٹ عدالت میں نہ پہنچتی اور کیس کامران کے حق میں کمزور نہ ہوتا، تب تک عدالت سے ضمانت نامہ حاصل نہ ہوتا۔

اور توقع کے خلاف یہ کیس کامران کے خلاف ہوگیا۔ پولیس نے معلوم کیا کہ وہ ریوالور لائسنس یافتہ نہیں تھا۔ غیر قانونی تھا۔ یہ ثابت نہیں ہوسکا تھا کہ جبار ہمدانی وہ ریوالور لے کر قتل کی نیت سے آیا تھا۔

اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ وہ آمنہ کو کیوں قتل کرے گا؟ جبکہ اس کا سمدھی بن چکا تھا۔ پہلے بھی آمنہ سے دشمنی نہیں تھی۔ دونوں گھرانوں میں بہترین تعلقات تھے۔ وہ اچانک دشمن کیوں بن گیا؟

آمنہ کا یہ بیان قابل قبول نہیں تھا کہ جبار اپنے داماد عدنان کو تمام دولت اور جائداد کا تنہا وارث بنتے دیکھنا چاہتا تھا اور اسی مقصد کے لیے کامران کو آمنہ کو قتل کرنا چاہتا تھا۔

آمنہ کو اس لیے ہلاک کرنا چاہتا تھا کہ اس کی موت کے بعد پھر کوئی وارث پیدا نہیں ہوگا۔ یہ کہا جارہا تھا کہ آمنہ اپنے بیٹے کامران کو بچانے کے لیے باتیں بنارہی ہے۔

سرکاری وکیل کہہ رہا تھا، کامران اور جبار کے درمیان پہلے سے دشمنی چلی آرہی تھی۔ جو کسی کے علم میں نہیں تھی۔ کامران اپنے پاس غیر قانونی اسلحہ رکھتا تھا۔ جبار ریوالور لے کر اس کے گھر نہیں گیا تھا۔

جبکہ کامران کا بیان تھا کہ دونوں ایک دوسرے سے ریوالور چھیننا چاہتے تھے۔ کامران نے اپنی اور اپنی ماں کی سلامتی کے لیے گولی چلائی تھی۔

ریوالور کے لیے چھینا جھپٹی ہوئی تھی یا نہیں؟! سے کامران کا من گھڑت بیان سمجھا جارہا تھا۔ اہم نقطہ یہ تھا کہ اس نے گولی چلائی تھی۔ وہ اقبالِ جرم کرچکا تھا۔

آمنہ اور صادق حسین نے بائیس برس کے بعد بیٹے کو حاصل کیا تھا۔ اسے اپنا نام دیا تھا لیکن عدالت میں کہا جارہا تھا کہ اس کی ماں آمنہ تو ہے مگر صادق حسین اس کا باپ نہیں ہے۔ وہ آمنہ کے گناہ کو چھپانے کے لیے کامران کو باپ کا نام دے رہا ہے۔

بائیس برسوں تک لاوارث رہنے کے نتیجے میں اس کی پیدائش کئی پہلوؤں سے مشکوک ہوگئی تھی۔

اور یہی قتل کی وجہ تھی کہ جبار نے اسے ناجائز کہہ تھا، ناقابلِ برداشت گالی دی تھی اور کامران نے طیش میں آکر اسے گولی ماردی تھی۔

یہ ثابت ہورہا تھا کہ وہ قاتل ہے اور جبار بے گناہ ثابت ہورہا تھا۔ وہ اپنی بیٹی سے ملنے اس کے سسرال آیا تھا اور کامران نے اسے دشمنی کی بنا پر ہلاک کردیا۔

اس قتل کی ایک اور ٹھوس وجہ بیان کی گئی کہ جبار ہمدانی کامران کو لاوارث ہی کہتا آرہا تھا اور یہ کہ وہ گناہ کی پیداوار ہے۔ اسے مصلحتاً جائز قرار دیا جارہا تھا اور جبار اسے جائز تسلیم نہیں کررہا تھا۔ یہی ان کے درمیان دشمنی کی بنیادی وجہ تھی۔

فردا چپ تھی۔ بظاہر آنکھیں خشک تھیں مگر اندر آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ عجب سہاگن تھی، ازدواجی مسرتوں کی ایک رات بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

وہ جیل میں کامران سے ملنے گئی تھی وہ کہہ رہا تھا۔ ”پتا نہیں، خدا کو کیا منظور ہے؟ وہی جانتا ہے کہ ان سلاخوں سے باہر آسکوں گا یا نہیں؟ ہمیں زندگی کی مسرتیں حاصل ہوسکیں گی یا نہیں؟“

... دونوں ہی دن رات عبادت کرتے تھے اور عدالت سے باعزت طور پر بری ہونے کی دعائیں مانگتے تھے۔ مقدمہ رخ بدلتا جارہا تھا۔ اس کے خلاف ہوتا جارہا

تھا۔

وہ ازل سے بدنصیبی لکھوا کر لایا تھا۔ ماں اور باپ کے ساتھ رہنا نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ اب فردا کی محبت اور قربت ملتے ملتے چھن گئی تھی۔

کچھ یہی حال ماہم کا تھا۔ اس نے عدنان کے ساتھ ازدواجی مسرتوں کے پانچ دن گزارے تھے۔ پھر عدنان نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ آئندہ اپنی زندگی سے بھی نکالنے والا تھا۔

وہ کہنے لگی۔ ”میں موت سے پہلے تمہاری زندگی سے نہیں نکلوں گی۔ میری محبت، میری وفاؤں کو سمجھو۔ تم ہی میری زندگی میں پہلے ہو اور آخری ہو۔ تمہارے سوا کسی کا منہ نہیں دیکھوں گی۔“

پھر ایک ماہ بعد ہی وہ امید سے ہو گئی۔ عدنان اور زیادہ اس کے حواس پر چھا گیا۔ اگرچہ دور ہو گیا تھا لیکن جان سے زیادہ قریب آ چکا تھا۔ اس کی کوکھ کے اندر دستک دے رہا تھا کہ دروازہ کھولو میں آ گیا ہوں...

اس نے دوسرے مہینے فون پر کہا۔ ”عدنان! آ جاؤ۔ الٹرا ساؤنڈ سے معلوم ہوا ہے، بیٹا ہوگا اور وہ ضرور تمہارے جیسا ہوگا۔“

عدنان نے کہا۔ ”یقیناً میں اسے چومنا اور سینے سے لگائے رکھنا چاہوں گا لیکن پہلے وہ کرو، جو میں کہتا ہوں۔ میرے بھائی کے خلاف بیان بدل دو۔ یہ سب جانتے ہیں کہ تمہارے باپ نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی نیکی نہیں کمائی۔ میری امی سے اور بھائی سے دشمنی کی کوئی خاص وجہ ہوگی۔ اگر ایسی کوئی بات ہے تو اس کی کمزوریاں بیان کرو۔“

”تم چاہتے ہو میں اپنے مظلوم اور مقتول ڈیڈی کے کیس کو کمزور بنا دوں۔ میرے ڈیڈ کی روح مجھے دیکھ رہی ہے۔ میں ایک بیٹی ہوں۔ اپنے باپ کے لیے انصاف ضرور چاہوں گی۔“

چھ ماہ تک فون کے ذریعے بحث و تکرار ہوتی رہی۔ آخر عدالت نے کامران کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ اس روز جج کی آواز فردا کے کانوں میں صورِ اسرافیل کی طرح گونجی۔ وہ ایسے لرز گئی کہ کھڑے کھڑے گر پڑی۔

ایک موہوم سی امید تھی۔ عدالتِ عالیہ میں اپیل کرنے سے شاید روٹھی ہوئی تقدیر مان جاتی۔ رہائی تو نہ ملتی، شاید سزائے موت عمر قید میں بدل جاتی۔ ایسا کچھ ہو سکتا تھا۔ ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا رہ گیا تھا۔

فردا جب اس سے بچھڑتی تھی تو یہ آسرا رہتا تھا کہ فون کے ذریعے نصف ملاقات ہوتی رہے گی۔ پھانسی پانے والے قیدی سے یہ رعایت چھین لی گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی آواز بھی نہیں سن سکتے تھے۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ سزائے موت پر عمل نہیں ہو رہا تھا۔ کامران سے پہلے بھی سزائے موت پانے والے دو قیدی اپنے آخری دنوں کا انتظار کر رہے تھے۔ موت ابھی ٹل رہی تھی۔ اس کے باوجود اٹل تھی۔ کسی دن کامران کو تختہ دار پر اپنی سانسوں سے رخصت ہونا تھا۔

آمنہ روتی رہتی۔ عبادت کرتی رہتی کہ جو بیٹا پیدا ہوتے ہی بچھڑ گیا تھا، وہ ملتے ہی پھر بچھڑ جانے والا تھا۔

وہ صادق سے رو رو کر کہتی۔ ”میرا بیٹا میری جان بچا کر اپنی جان پر کھیل رہا ہے۔ اسے بچا لیں۔ سیدھے راستے سے رہائی نہیں مل رہی ہے تو کسی چور دروازے سے نکال لائیں۔ ہم اسے کسی دوسرے ملک لے جائیں گے۔“

صادق حسین کچھ زیادہ بولتا نہیں تھا مگر بیٹے کے لیے اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا۔ اس ملک میں اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھنے والے اور قانون بنانے اور بگاڑنے والے سب ہی بک جاتے ہیں۔ وہ درپردہ عدالت کا فیصلہ بدلنے کے لیے متعلقہ عہدیداروں کو بڑی سے بڑی قیمت ادا کر کے انہیں خریدنا چاہتا تھا۔ بیٹے کو بچانے کے لیے طرح طرح کی تدابیر پر عمل کر رہا تھا۔

ان ہی دنوں ماہم نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ بچہ باپ کی طرح خوبرو اور صحت مند تھا۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ اس نے فوراً ہی عدنان کے نمبر پنچ کیے۔ دوسری طرف کال بیل پہنچی لیکن اس نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ فون بند کر دیا۔

اس سے پہلے بھی اس نے یہی کیا تھا۔ یہ کہہ چکا تھا کہ فون پر بھی اس سے بات نہیں کرے گا۔ ماہم نے کئی بار اسے خوشخبری سنانے کی کوشش کی پھر تھک ہار کر رونے لگی۔

اس نے اپنے محبوب شوہر کے بچے کو جنم دیا تھا۔ اسے یہ خوشخبری سنائے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے سم بدل کر فون کیا تو اپنی ساس آمنہ کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو کون...؟“

اس نے کہا۔ ”آپ دادی بن گئی ہیں۔ اگر پوتے کی ایک جھلک دیکھ لیں گی تو خوشی سے جشن منائیں گی۔“

آمنہ نے کہا۔ ”بے شک۔ یہ بہت بڑی خوشخبری ہے لیکن تمہارے شیطان باپ نے ہماری آنکھوں میں آنسو بھر دیے ہیں۔ ہم ہنسنا مسکرانا بھول گئے ہیں۔“

”پلیز۔ اپنے بیٹے سے بات کرائیں۔“

”وہ جیل میں ہے۔“

”میں عدنان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

”جب تک اپنے باپ کے خلاف سچ نہیں بولو گی، تب تک عدنان کی آواز بھی نہیں سن سکو گی۔ میں اسے یہ نہیں بتاؤں گی کہ تم نے ہمارے خاندانی لہو سے ایک بچے کو جنم دیا ہے۔“

آمنہ نے فون بند کر دیا۔ وہ بے چین ہو گئی۔ آخر بڑی خبر اس کے عدنان تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ بری طرح تڑپنے لگی...

اس نے پھر ایک سم بدل کر اسے فون کیا۔ اس بار عدنان کی آواز سنائی دی۔ ہائے وہ تنہائیوں میں بولنے والا جادو جگانے والا کئی مہینوں کے بعد پھر بول رہا تھا۔ اس کی آواز وصال کے گزشتہ لمحات کو بیدار کر رہی تھی۔

اس نے پھر پوچھا۔ ”ہیلو کون...؟“

وہ بڑے جذب سے بولی۔ ”میں تمہارے بچے کی ماں بن گئی ہوں۔ تمہیں اس نومولود بیٹے کی قسم دیتی ہوں، مجھ سے بات کرو۔“

وہ ذرا چپ رہا پھر بولا۔ ”تم نے بہت ہی اہم خبر سنائی ہے۔ لیکن تم...... میری ایک بات کا جواب دو، ابھی کوئی وہاں آئے اور ہمارے بیٹے کو سولی پر لٹکا دے تو کیسا لگے گا؟“

وہ سر سے پاؤں تک لرز گئی، چیخ کر بولی۔ ”نہیں۔ یہ معصوم ابھی دنیا میں آیا ہے۔ ایسی باتیں نہ کرو۔“

”میری امی سے پوچھو، ان کا کامران بھی دنیا میں آنے کے بائیس برس بعد انہیں ملا ہے۔ میرے بھائی ہمارے بیٹے کی طرح معصوم ہیں۔ تم ماں بن چکی ہو۔ میری ماں کے درد کو سمجھو۔ ابھی عدالت میں جاؤ اور بیان بدل دو۔ سچ بولو۔ میں وہاں آ کر اپنے بیٹے کو سینے سے لگا لوں گا۔ تمہیں بڑی عزت سے اپنے گھر لاؤں گا۔“

وہ دوراہے پر کھڑی تھی۔ اپنے بچے کی خاطر پٹڑی بدل سکتی تھی۔ بیان بدل سکتی تھی۔ مکمل ثبوت کے ساتھ اپنے باپ کی کمزوریاں پیش کر سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

اسی رات باپ نے خواب میں آ کر کہا۔ ”بیٹی! ہرگز کمزور نہ پڑنا۔ عدنان کی نفرت عارضی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی خاطر تمہارے آگے ضرور جھکے گا۔ کامران کو سزا پانے دو۔ اس کے بعد عدنان کے تمام راستے تمہاری ہی طرف آئیں گے۔“

وہ ایسا حوصلہ افزا خواب تھا کہ وہ پہلے کی طرح اپنے

موقف پر ڈٹ گئی۔ زمین پر زلزلہ آ جائے، آسمان ہل جائے مگر وہ ہلنے والی اور بیان بدلنے والی نہیں تھی۔

ایک روز کامران کال کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس وقت آہنی سلاخوں والا دروازہ کھلا۔ عدالت کا ایک اہل کار، جیل... سپرنٹنڈنٹ اور دو افسران وہاں آئے۔ اہل کار نے کہا۔ ”کامران ولد صادق حسین عدالتی حکم کے مطابق تمہاری موت کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔“

کامران نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس نے کہا۔ ”آج سے ٹھیک دسویں روز دس نومبر تک تمہارا دم نکلنے تک تمہیں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔“

وہ اجل نامہ پڑھ رہا تھا اور کامران خاموشی سے سن رہا تھا۔ اہل کار کہہ رہا تھا۔ ”عدالت نے قانون کے مطابق حکم دیا ہے کہ تمہاری آخری خواہش پوری کی جائے۔“

کامران انہیں دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ ”میں ایک سہاگن کی پہلی خواہش پوری نہ کر سکا۔ اب آخری دنوں میں آخری خواہش بھلا کیا ہوگی؟“

جیل... سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ ”اپنا کوئی مناسب اور قابلِ قبول مطالبہ پیش کرو۔ اسے تسلیم کیا جائے گا۔“

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں اپنی زندگی کی آخری چند راتیں اپنی شریکِ حیات فردا کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔“

ان سب نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک افسر نے کہا۔ ”کسی بھی اپنے یا پرائے کو سزائے موت پانے والے کے قریب آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ تمہاری یہ خواہش قابلِ قبول نہیں ہے۔“

کامران نے کہا۔ ”وہ میری زندگی کی ساتھی ہے۔

اسے میری آخری سانسوں تک ساتھ رہنا چاہیے۔ میری یہ خواہش نامناسب نہیں ہے۔''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''مناسب ہے۔ لیکن ہم قانون سے مجبور ہیں۔''

''اگر بات مناسب ہے تو ازراہ ہمدردی قانون میں لچک پیدا کی جاسکتی ہے۔''

''ہم تمہاری یہ اپیل عدالت تک پہنچادیں گے۔''

''اگر میری اپیل کو رد کیا جائے گا تو پھر آخری خواہش یہ ہوگی کہ میری رد کردہ خواہش کو تمام پریس اور میڈیا تک پہنچایا جائے۔''

انہوں نے وعدہ کیا کہ اس کی کسی ایک خواہش کو پورا کیا جائے گا۔

دوسرے دن عدالت میں اس کی اپیل نامنظور ہوگئی۔

تیسرے دن یہ خبر پریس ریلیز کے طور پر جاری کی گئی کہ ٹھیک ایک ہفتے بعد کامران کو پھانسی دے دی جائے گی۔ اس کی آخری خواہش یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کی بقیہ راتیں اپنی شریک حیات کے ساتھ جیل کی کال کوٹھری میں گزارنا چاہتا ہے۔

یہ چونکا دینے والی خبر تھی۔ تمام اخبارات نے اسے پہلے صفحے پر شائع کیا۔ ٹی وی چینلز بھی دن رات یہ خبر نشر کرنے لگے کہ آخری سانس لینے والا قیدی اپنی بیوی سے ازدواجی رشتہ نبھانا چاہتا ہے۔

فردا اپنے کامران کی آخری خواہش سنتے ہی تڑپ گئی۔ اس نے اپنے والدین اور وکیل سے کہا۔ ''عدالت میں اپیل کی جائے۔ میرے کامران کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو میں عدالت کی دہلیز پر اپنی جان دے دوں گی۔''

جمال جمشید اور اس کے وکیل نے تگ ودو شروع کر دی۔ پریس اور مختلف میڈیاز کی طرف سے ان کی حمایت کی جارہی تھی۔ بڑے بڑے قانون داں اور علمائے دین سے اس سلسلے میں ان کے خیالات و افکار معلوم کیے جارہے تھے۔

تمام علما اور قانون داں فردا اور کامران کے حق میں بیان دے رہے تھے۔ فردا اپنا مسئلہ حل کرانے کے لیے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی شخصیات سے التجا کررہی تھی۔

اگر کامران کو سزا دی گئی ہے تو اس کی بیوی کو کیوں سزا دی جارہی ہے؟ ایک بیوی کے حق کو سلب کرنا سراسر زیادتی ہے۔

خدا خدا کرکے سات نومبر کو اجازت مل گئی۔ عدالتی حکم کے مطابق وہ صرف آٹھ نومبر کی رات خاوند کے ساتھ رہ سکتی تھی۔ نو نومبر کامران کی زندگی کی آخری رات تھی۔ دوسری صبح پھانسی دی جانے والی تھی۔ لہٰذا آخری رات فردا کو اس کے پاس رہنے کی اجازت نہیں تھی۔

وہ آٹھ نومبر کی شام کو آکر نو نومبر کی صبح کامران سے بچھڑنے والی تھی۔ وہ روتی ہوئی جیل کی چار دیواری میں آئی۔ اپنے ساتھ ایک جائے نماز لائی تھی۔ ان کے لیے کال کوٹھری کے قریب ہی ایک کشادہ کمرا مخصوص کیا گیا تھا۔ کامران سے سامنا ہوتے ہی وہ چیخیں مارتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

کامران اسے آغوش میں لیے گم صم کھڑا تھا۔ اس کے اندرونی کرب کو سمجھ رہا تھا۔ وہ آخری بار ملنے آئی تھی۔ اس کے بعد وہ قیامت کی نیند سو جاتا۔ تمام دکھ درد سے نجات پالیتا لیکن وہ ساری عمر اس کے نام کا خنجر کلیجے میں پیوست کیے رہتی۔ اوپر سے شانت رہتی، اندر سے ماتم کرتی رہتی۔

اس نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ ''چپ ہوجاؤ۔ آنسو پونچھ لو۔ بس یہی ایک رات ہے۔ اسے ہنس کر گزارو یا رو کر گزارو۔ قدرتی معاملات اٹل ہیں۔ مجھے جانا ہے چلا جاؤں گا۔ تمہارے آنسو تقدیر نہیں بدل سکیں گے۔''

وہ اس کے آنسو پونچھنے لگا۔ جیل خانے کی مسجد سے عشاء کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ دونوں نے وضو کیا۔ قیدیوں کو نماز پڑھنے کے لیے مصلا دیا جاتا ہے۔ وہ دونوں نماز ادا کرنے کے لیے اپنے اپنے مصلے پر کھڑے ہوگئے۔

کامران کے دل سے آواز نکل رہی تھی۔ ''یا اللہ! ہم تو ایک سیدھی سادی زندگی گزار رہے تھے۔ ہم نے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ پھر یہ بیٹھے بٹھائے کیسی آزمائش میں مبتلا ہوگئے ہیں؟ کیا یہ آزمائش میری موت پر ہی ختم ہوگی؟

اے میرے معبود! تیری رضا پر راضی رہنا ہے اور راضی نہیں رہیں گے تو کیا کرلیں گے؟ زندگی کو پھر سے کیسے پالیں گے؟''

دونوں نماز ادا کرنے کے بعد ایک جگہ فرش پر بیٹھ گئے۔ ان کے لیے رات کا کھانا آیا۔ انہوں نے کھانے سے انکار کردیا۔ بھوک اڑ گئی تھی۔ رت جگا بھی تھا۔ نیند آنے والی نہیں تھی۔ کوئی ضرورت، کوئی خواہش کوئی ہوس نہیں رہی تھی۔

فردا کا سر اس کے شانے پر تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، چھو رہے تھے۔ اس سے زیادہ کی طلب نہیں رہی تھی۔

وہ دلہن پھولوں کی سیج پر آئی تھی اور نامراد رہی تھی۔ اب بھی کنواری دلہن تھی۔ جیل کے ننگے فرش پر آئی تھی۔ لیکن وہ دونوں جسمانی حصول کی ہوس سے خالی تھے، کیا موت کی دہلیز پر کوئی سہاگ رات منا سکتا ہے؟

ایسے وقت تو صرف خدا ہی یاد آتا ہے۔ انہیں عبادت کرنی تھی۔ تمام رات پاک وصاف رہ کر فجر کی نماز ادا کرنی تھی۔ عبادت کے لیے دعاؤں کی قبولیت کے لیے پاکیزگی لازمی ہوتی ہے۔

کامران نے پوچھا۔ ''میری ایک بات مانو گی؟''

''تمہاری ہر بات مانوں گی۔''

''دینی احکامات پر عمل کرتی رہو۔ ہمارے دین میں عورت کو تنہا رہنے سے منع کیا گیا ہے۔ میرے بعد تم شادی کرو گی۔ ازدواجی زندگی گزارو گی۔''

''بے شک، دین اسلام میں عورت کو تنہا رہنے سے منع کیا گیا ہے لیکن میں لڑکی ہوں۔ نہ شجر ممنوعہ کی طرف گئی ہوں، نہ ہی میں نے بہکنے اور بہکانے والا پھل چکھا ہے۔''

''بحث نہ کرو فردا...!''

''تم بحث نہ کرو۔ جو سچ ہے اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ ابھی تنہائی میں، میں ہوں، میرا محبوب ہے، کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ پھر بھی بہک نہیں رہی ہوں اور نہ تمہیں ترغیب دے رہی ہوں۔''

وہ اس حقیقت کے سامنے چپ رہا۔ وہ بولی۔ ''بعض لڑکیاں بڑی مستقل مزاج ہوتی ہیں۔ ساری زندگی پل صراط سے، تلوار کی دھار پر سے گزرتی رہتی ہیں۔ کبھی خود پر کسی مرد کا سایہ نہیں پڑنے دیتیں۔ تم یہ بحث نہ کرو۔ ہم دوسری باتیں کریں گے۔''

''دوسری کوئی بات نہیں ہے۔ کل میری زندگی کی شام ہے۔ دوسری صبح آخری نماز پڑھوں گا پھر میری آخری نماز دوسرے پڑھیں گے۔''

وہ وہاں سے اٹھ گئے۔ پھر جائے نماز پر آگئے۔ نفل پڑھنے لگے۔

''اے خدا! یہ میرا مجازی خدا ہے۔ تو زندگی کے بدلے زندگی نہیں دیتا' اگر دیتا ہے تو ابھی میری جان کھینچ لے۔ میرے شوہر کو نئی زندگی دے دے۔''

اس نے کامران سے کہا۔ ''جب سے تمہیں قیدی بنایا گیا ہے' تب سے میں اللہ تعالیٰ کے نام کا وظیفہ پڑھتی رہتی ہوں۔ یا وکیل، یا کفیل...''

کامران نے کہا۔ ''میں بھی وظیفہ پڑھتا رہتا ہوں۔ یا مجیب یا حق... سنا ہے، پڑھنے والے کو شکنجے سے نجات اور قید سے رہائی ملتی ہے۔''

وہ اپنی داہنی ہتھیلی دکھاتے ہوئے بولا۔ ''اگر ہتھیلی پر یاحق لکھ کر اسے دعائیہ انداز میں آسمان کی سمت اٹھائے اور یا حق پڑھتا رہے تو مقدمے میں کامیابی ہوتی ہے۔''

وہ ذرا رک کر بولا۔ ''ہمیں یہاں ایک قلم تو کیا' ایک ننھی سی تیلی بھی نہیں دی جاسکتی۔ میں ہتھیلی پر لکھ نہیں سکتا اس لیے چشم تصور سے دیکھتا ہوں۔ مجھے اپنی ہتھیلی پر یاحق لکھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔''

وہ اپنی ہتھیلی کو دعا مانگنے کے انداز میں آسمان کی سمت اٹھا کر پڑھنے لگا۔ ''یا مجیب، یا حق...''

وہ بھی پڑھ رہی تھی۔ ''یا وکیل، یا کفیل...''

اس کمرے کی چار دیواری میں وظیفے کی دھیمی دھیمی سی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ خوشبو کی طرح پھیل رہی تھیں اور یقیناً آسمان کی طرف جارہی تھیں۔

رات گزرتی جارہی تھی۔ وہ اسمائے حسنیٰ میں غرق تھے۔ آنکھیں کھلی رکھنے کے باوجود وہ کمرا نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ انہوں نے خود کو اسمائے حسنیٰ میں جذب کردیا تھا۔ یہ

نہیں جانتے تھے کہ کس عالم نامعلوم میں پہنچ گئے ہیں۔

یوں پتا نہ چلا' رات کیسے گزر گئی؟ پھر فجر کی اذان انہیں اس کمرے میں واپس لے آئی۔ انہوں نے مصلے پر کھڑے ہو کر نماز ادا کی۔ دعا مانگی۔ پھر فردا بے اختیار اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ جیلر نے لیڈی کانسٹیبل کے ساتھ آ کر کہا۔ ''بی بی! باہر آجاؤ۔ ملاقات کی مدت ختم ہو چکی ہے۔''

کامران اسے تھپکتا ہوا صبر کی تلقین کرتا ہوا آہنی سلاخوں کے پاس آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس سے دور نہیں ہونا چاہتی تھی۔ دو لیڈی کانسٹیبل نے اسے پکڑ لیا۔ اسے باہر لے آئیں۔

ہمیشہ کے لیے بچھڑنا تھا لیکن کوئی خوشی سے نہیں بچھڑتا۔ وہ دو عورتیں اسے جبراً وہاں سے لے گئیں۔ کامران اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اب نہ وہ اسے کبھی دیکھ سکتی تھی' نہ اس کی آواز سن سکتی تھی۔

☆☆☆

جس دن کامران کو موت کی اٹل تاریخ سنائی گئی، اس روز ماں کا کلیجہ کانپ اٹھا۔ وہ روتے ہوئے صادق حسین سے لپٹ کر بولی۔ ''کسی بھی طرح میرے بیٹے کو بچالیں۔ نہیں تو میں مرجاؤں گی۔ تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے۔ کوئی تدبیر کریں، کچھ بھی کریں۔ میرے کامران کو واپس لے... آئیں۔''

صادق نے اپنے وکیل سے کہا۔ ''آپ نے وکالت کے پیشے میں بڑے بڑے تجربات کیے ہیں۔ بڑے ہی پیچیدہ مقدمات میں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ پلیز۔ پھر سے قانون کی کتابیں پڑھیں۔ کوئی ایسا نکتہ ڈھونڈ کر نکالیں کہ کامران کی سزا معاف ہو جائے یا سزائے موت عمر قید میں بدل جائے۔''

وہ سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ طرح طرح کی تدابیر سوچنے لگے۔ وقت بہت کم تھا۔ بہت زیادہ سوچنے کی مہلت نہیں تھی۔ جو کرنا تھا' جلد ہی کر گزرنا تھا۔ پھر ایک دن آمنہ نے ماہم کو فون پر مخاطب کیا۔ اس نے بڑی امیدوں سے پوچھا۔ ''کیا عدنان مجھ سے راضی ہو رہا ہے؟''

آمنہ نے کہا۔ ''میں اس کی ماں ہوں' اگر چاہوں تو وہ تم سے راضی ہو سکتا ہے۔ ابھی اس لیے فون کیا ہے کہ میں نے خواب میں اپنے پوتے کو دیکھا تھا۔ وہ میری گود میں کھیل رہا تھا۔ میں اسے دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہی ہوں۔''

''میں بچے کو لے کر آپ کے گھر آ سکتی ہوں؟''

''عدنان تمہیں یہاں قدم رکھنے نہیں دے گا۔ مجھ سے بارہ دری یا قلعے میں آ کر ملو۔ ہم دونوں مل کر عدنان کو راضی کرنے کی کوئی تدبیر کریں گے۔''

''میں عدنان کو منانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔''

''ایک گھنٹے بعد قلعے کے عجائب گھر کے سامنے پہنچو۔ میں آ رہی ہوں۔ اپنے پوتے کی تصویریں بھی اتاروں گی۔''

وہ دوپہر دو بجے اپنے بچے کو سینے سے لگائے وہاں آ گئی۔ آمنہ پہلے سے اس کی منتظر تھی۔ بچے کو اس سے لے کر سینے سے لگا کر پیار کرنے لگی۔

دوپہر کے وقت وہاں لوگوں کی آمد و رفت کم ہوتی ہے۔ وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی نسبتاً سنسان جگہ آ گئیں۔

آمنہ نے کہا۔ ''تم ماں کی ممتا کو خوب سمجھ رہی ہو۔ میرا بیٹا پھانسی پانے والا ہے۔ ذرا سوچو! میرے دل پر کیا گزر رہی ہو گی؟''

وہ بے نیازی سے بولی۔ ''میں کیا کر سکتی ہوں؟ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔''

''مجھ سے ہمدردی نہ کرو۔ تم بھی ماں ہو۔ یہ سوچو ابھی تمہارے بچے کی جان پر بن آئے تو تم کیا کرو گی؟''

''خدا نہ کرے' میرے بچے کو کچھ ہو۔ آپ ایسی باتیں نہ کریں۔''

''میں نے ایسی ہی باتیں کرنے کے لیے تمہیں یہاں بلایا ہے۔''

آمنہ نے پرس کی جیب سے ایک چاقو نکالتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے شور مچانے سے پہلے ہی یہ ننھی سی جان اپنی جان سے چلی جائے گی۔ پھر دن رات واویلا کرتی رہو گی' تب بھی یہ بچہ میرے کامران کی طرح واپس نہیں آئے گا۔''

ماہم کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ بچہ چاقو کی نوک پر تھا۔ وہ چند لمحوں تک سانس لینا بھول گئی پھر تڑپ کر بولی۔ ''یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ یہ آپ کا پوتا ہے۔''

''نہیں۔ یہ صرف تمہارا بیٹا ہے' تم اس کی ماں ہو اور میں اپنے بیٹے کامران کی ماں ہوں۔ وہ آج سے پانچویں دن پھانسی پائے گا۔ تم نے میری بات نہ مانی تو تمہارا بیٹا ابھی جان سے جائے گا۔''

ماہم نے دیکھا، اس کا بیٹا جس کپڑے میں لپٹا ہوا تھا' آمنہ نے چاقو کو اس کپڑے میں چھپا لیا تھا۔ ادھر سے گزرنے والوں کو وہ چاقو نظر نہیں آ سکتا تھا۔

اس کی ممتا لرز رہی تھی۔ یہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے شور مچاتے ہی... ساس اس کے بچے کو مار ڈالے گی، وہ تڑپ کر بولی۔ ''چاقو ہٹائیں۔ مجھے بتائیں، آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''وہی جو عدنان تم سے کہہ چکا ہے۔ اپنا بیان بدل دو۔''

ایسے وقت صادق حسین اپنے وکیل کے ساتھ وہاں آ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''بات کہاں تک پہنچی؟''

آمنہ نے کہا۔ ''میں اس سے کہہ رہی ہوں، یہ بیان نہیں بدلے گی تو ابھی اپنے بچے کو لہو میں نہاتے ہوئے دیکھے گی۔''

وہ رو رہی تھی۔ بچے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں، اس کا دل اور اس کا سارا وجود اپنے بچے کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''آپ زبردستی کیسے کریں گی؟ اگر میں ابھی بیان بدلنے پر راضی ہو جاؤں، بچے کو سلامتی سے اپنے سینے سے لگا کر لے جاؤں اور بعد میں مکر جاؤں تو آپ کیا کر لیں گی؟''

''یہ بچہ ابھی تمہیں نہیں ملے گا۔ جب تک عدالت میں بیان نہیں بدلو گی۔ اپنے باپ کا کچا چٹھا بیان نہیں کرو گی۔ تب تک یہ ننھی سی جان میرے پاس رہے گی۔''

صادق نے کہا۔ ''تم کسی سے یہ نہیں کہہ سکو گی کہ بچے کو اغوا کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ اپنے باپ عدنان کے پاس رہے گا۔''

آمنہ نے کہا۔ ''جب تک ہماری بن کر رہو گی۔ کامران کے حق میں بیان دے کر اس پر قائم رہو گی تب تک یہ بچہ زندہ سلامت رہے گا۔''

یہ کہہ کر اس نے فون نمبر ملایا۔ پھر رابطہ ہونے پر فون... ماہم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لو عدنان سے بات کرو۔''

اس نے فون کو لپک لیا۔ فوراً ہی کان سے لگا کر کہا۔ ''عدنان! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''

وہ بولا۔ ''وہی جو میری ماں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ اگر تم ہماری ہو تو یہ بچہ بھی ہمارا ہے۔ ہم اس ننھی سی جان کے محافظ ہیں۔ اگر دشمن ہو تو یہ بچہ تمہارا ہے۔ میری ماں کا بیٹا جائے گا تو تمہارا بیٹا بھی ہمیشہ کے لیے نابود ہو جائے گا۔''

''عدنان! ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تمہارے پاس آنا چاہتی ہوں۔''

''میرے پاس عزت سے، محبت سے اور شرافت سے آؤ۔ یہاں تمہیں ساری عمر سر آنکھوں پر بٹھایا جائے گا۔ جیسے ہی کیس میرے بھائی کے حق میں ہو گا، میں تمہیں لینے کے لیے تمہارے دروازے پر آؤں گا۔ اس سے پہلے سوری...''

اس نے فون بند کر دیا۔ ماہم نے فون کو دیکھا۔ وہ عدنان کا پیار بھرا فیصلہ سن کر چپ ہوگیا تھا۔ اس کی یہ بات سحر زدہ کر رہی تھی کہ وہ اسے لینے کے لیے اس کے دروازے پر آئے گا۔

وہ آمنہ اور صادق حسین کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میں بیان بدل دوں گی۔ سب سے پہلے میرے ڈیڈ کے دست راست اور ہمراز زبیر کو گرفتار کرائیں۔ اس سے سچ اگلوائیں۔ پھر آپ کے بیٹے کی بے گناہی ثابت ہوجائے گی۔“

آمنہ نے کہا۔ ”شاباش بیٹی! اب یہ میرا پوتا ہے۔ مقدمہ جیسے ہی ری اوپن ہوگا، عدنان تمہیں عزت سے گھر لائے گا۔ وہاں تم اپنے بیٹے کو کلیجے سے لگا سکوگی۔“

ماہم نے اپنے بیٹے کو گود میں لے کر پیار کیا۔ اسے ساس کے حوالے کیا۔ پھر صادق حسین اور وکیل کے ساتھ اپنا بیان بدلنے کے لیے چلی گئی۔

صادق تیزی سے حرکت میں آگیا۔ اس نے پولیس کے اعلیٰ افسران کو لاکھوں روپے پیش کیے۔ انہوں نے زبیر کو گرفتار کر کے ٹارچر سیل میں پہنچا دیا۔ وہ لاتوں کا بھوت تھا، باتوں سے ماننے والا نہیں تھا۔ ٹارچر سیل میں اسے ایسی اذیتیں پہنچائی گئیں کہ اس کے ہوش اڑ گئے۔

وہ سچ اُگلنے لگا۔ اس نے تحریری بیان دیا کہ جبار ہمدانی نے نہر کے کنارے کامران کو قتل کرنے کی ناکام کوششیں کی تھیں۔ اس نے جو گولیاں چلائیں وہ ایک فقیر بابا کو لگیں۔

اس بیان کی روشنی میں علاقے کے تھانے میں انکوائری کرائی گئی۔ اس بات کی تصدیق ہوئی کہ اس روز صبح کے وقت چلتی ہوئی کار سے فائرنگ کی گئی تھی۔ وہاں کامران چشم دید گواہ کے طور پر اپنا بیان قلم بند کرا چکا تھا۔

زبیر نے ایک رینٹ اے کار والوں کا پتا بتایا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جبار نے ایک رات پہلے وہاں سے ایک کار کرائے پر حاصل کی تھی اور اسی کار میں بیٹھ کر فائرنگ کی تھی۔

زبیر نے قتل کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”جبار اپنے داماد عدنان کو اس کے والدین کا تنہا وارث بنانا چاہتا تھا۔ کروڑوں اربوں کی دولت اور جائداد میں کسی حصے دار کو برداشت نہیں کر رہا تھا اسی لیے اس نے کامران پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔“

زبیر نے کہا۔ ”جبار نے دس برس پہلے اپنے دو سگے بھائیوں کو بھی بڑی رازداری سے موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے کاروبار میں حصے دار بھائیوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔“

پولیس والے ان کے قتل کی واردات کے سلسلے میں جبار پر شبہ کر رہے تھے۔ زبیر کے بیان سے ان کا شبہ درست ثابت ہوا۔ یوں جبار ہمدانی تین قتل کی واردات کا مجرم ثابت ہو رہا تھا۔

پھر اس کی بیٹی ماہم کے بیان سے زبیر کے بیان کی تصدیق ہوگئی۔ چار دنوں کے اندر ہی جیسے کایا پلٹ گئی۔ اس قدر ٹھوس ثبوت اور گواہوں کو عدالت میں تسلیم کرتے ہوئے کامران کی سزائے موت کو روک دیا گیا اور اس مقدمے کو دوبارہ شروع کرنے کی ہدایت کی گئی۔

یہ وہ وقت تھا، جب فردا اپنے کامران سے آخری ملاقات کرنے کے لیے جیل کی چار دیواری میں گئی تھی۔ وہ دونوں سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ دوسری صبح کیا معجزہ ہونے والا ہے؟ جب وہ کامران سے بچھڑنے کے بعد جیلر کے روم میں آئی تو وہاں جمال جمشید ایک عدالتی اہل کار کے ساتھ موجود تھا۔ وہ روتی ہوئی آکر باپ سے لپٹ گئی۔ وہ اسے تھپکتے ہوئے بولا۔ ”آنسوؤں کو پونچھ لو بیٹی! خدا نے ہماری فریاد سن لی ہے۔ کسی نے درست ہی کہا ہے، اوپر والے کے ہاں دیر ضرور ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔“

اس نے سوالیہ نظروں سے باپ کو دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ”عدالت کی طرف سے اسٹے آرڈر آگیا ہے۔ ہمارا کامران انشاء اللہ جلد ہی رہا ہو جائے گا۔“

یہ ایسی کامیابی تھی کہ فردا وہیں چکرا کر سجدے میں گر پڑی۔ مقدمہ پھر سے شروع ہوا تو دو پیشیوں کے بعد ہی تیسری پیشی میں کامران کو باعزت طور پر بری کر دیا گیا۔

بے شک۔ وہی رب کریم عزت دیتا ہے لیکن آزمائشوں میں بھی مبتلا کرتا ہے۔

اب کامران دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا تھا تو اس کی ہتھیلی پر لکھا ہوتا تھا۔ ”یا مجیب، یا حق...“

بے شک اللہ تعالیٰ شکنجوں سے نکالتا ہے۔

فردا دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی تھی تو اس کی ہتھیلی پر لکھا ہوتا تھا۔ ”یا وکیل، یا کفیل...“

بے شک اللہ تعالیٰ ناحق الزامات سے بری کرتا ہے۔

اور کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارا رب آزمائشوں سے گزارنے کے بعد ہی انعام دیتا ہے...